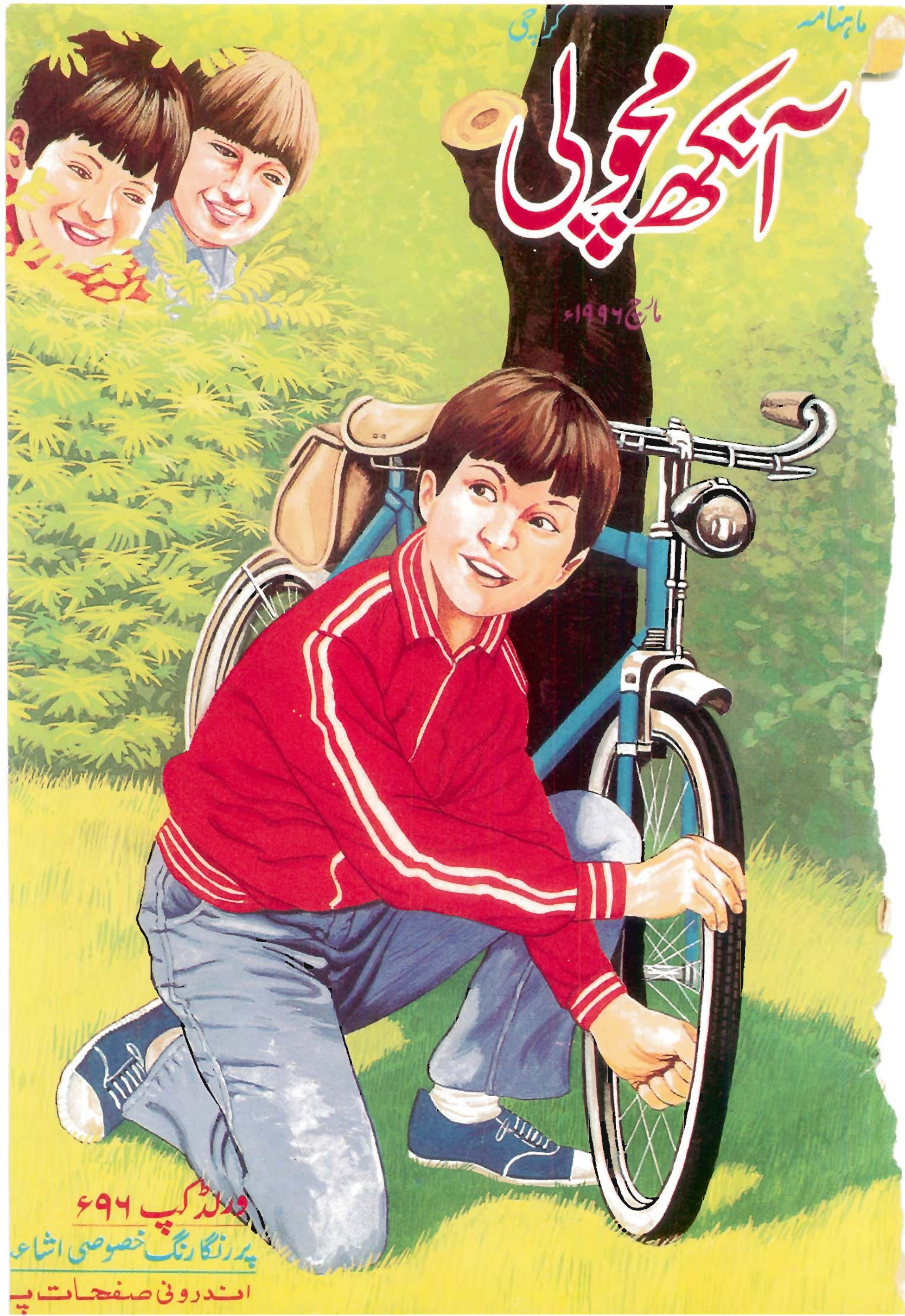
ماہنامہ
کراچی
آنکھ مچولی
مارچ ۱۹۹۶ء
ورلڈ کپ ۹۶ء
پر رنگا رنگ خصوصی اشاع
اندرونی صفحات پ

LASER DOT
Transworld

بہار ہو کہ برسات **صافی** آپ کی جلد کو شاداب و شگفتہ رکھتی ہے

جڑی بوٹیوں سے
تیار شدہ

صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

موسموں کی تبدیلی فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس تبدیلی سے خون میں پیدا ہونے والے فاسد مادّے امراضِ جلد کا سبب بنتے ہیں۔

صافی میں شامل مفید و مؤثر جڑی بوٹیاں خون کو قدرتی طور پر صاف اور صحت مند رکھتی ہیں اور آپ کی جلد نرم، ملائم اور چمکدار رہتی ہے۔

Adarts-SAF-1/93

ظلم اور دہشت کے خلاف ایک احتجاج

آنکھ مچولی کا

خصوصی شمارہ

مظلوم بچے نمبر

ایک خصوصی دستاویز

جون ۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آ رہا ہے

وہ پھول سے کومل بچے
جو گلی کوچوں میں بے گناہ قتل کر دیے گئے
اسکول جانے والے بچے
جو اسکول سے لوٹ کر گھر نہیں آئے
تاوان وصول کرنے کے لیے اغوا کئے جانے والے بچے
جن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا
اور وہ تمام بچے
جو کسی نہ کسی ظلم اور دہشت کا شکار ہو گئے
ان بچوں کے بارے میں آنکھ مچولی میں
جیتے جاگتے فیچر، جیتی جاگتی تصویریں، الم ناک کہانیاں، اداس کر دینے والی نظمیں، مظلوم والدین کے انٹرویوز

آپ بھی لکھیے

اگر آپ کے شہر یا محلّے میں ایسے کسی بچے کا اغوا یا قتل ہوا ہو تو معلومات جمع کیجئے اور مضمون یا فیچر تحریر کیجئے۔
یہ ایک قومی خدمت بھی ہو گی اور تحریر کا معاوضہ بھی ملے گا!

مضامین بھیجنے کا پتہ: مدیرِ اعزازی ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

MEMBER APNS

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مارچ ۱۹۹۶ء	شوال / ذیقعد ۱۴۱۶ھ	شمارہ نمبر ۹	جلد نمبر ۱۰

ظفر محمود شیخ

تجمل حسین چشتی

ڈاکٹر طاہر مسعود

محمد عمر احمد خان

عمران احمد

سلمان خان

دانش اختر

قیمت

۱۸ روپے

۷ درہم ۷ ریال

○ ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

○ ماھنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماھنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط وکتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۹۴۸۲۱۰ / ۴۹۴۲۸۵۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاھد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

تحفہ وہ جو یاد رہے

تحفہ دینا اظہارِ الفت بھی ہے۔ باعثِ محبّت بھی اور نبیؐ کی سُنّت بھی

تحفہ

آپ کے خلوص کا اظہار اور آپ کے ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے

اپنے دوستوں اور پیاروں کو سالگرہ کا تحفہ دیجئے۔ مگر ایسا جو سال بھر یاد رہے

آنکھ مچولی ایسا ہی تحفہ ہے

آپ ہمیں اپنے دوست کا نام، مکمّل پتہ، سالگرہ کا دن اور 280 روپے کا منی آرڈر روانہ کیجئے۔ ہم ایک خوب صورت برتھ ڈے کارڈ اور سال بھر کے لیے آنکھ مچولی آپ کے دوست کو بھجواتے رہیں گے۔ ماہ بہ ماہ تازہ شمارہ آپ کے دوست کو آپ کی محبتوں کی یاد دلاتا رہے گا۔

یاد رہے کہ آنکھ مچولی کے دس عام اور دو خاص شماروں کی سالانہ قیمت معہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ 444 روپے بنتی ہے۔ مگر خصوصی تحفہ اسکیم کے لیے صرف 280 روپے

اِس رعایت سے آج ہی فائدہ اُٹھایئے

منی آرڈر فارم پر نام اور پتہ مفصل لکھئے!

مشرقِ وسطیٰ کے لیے 650 روپے

امریکہ اور یورپ کے لیے 830 روپے

سستا اور انوکھا سالگرہ کا تحفہ

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کیجئے

سرکولیشن مینجر: ماہنامہ آنکھ مچولی اے پی آئی بی کالونی کراچی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	محمد سلیم امام	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
حمد باری تعالیٰ (نظم)	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (مرحوم)	۱۰
اللہ ان سے راضی ہو	سہیل عباس	۱۱
تلاش	محمد جاوید خالد	۱۳
اداس پرندے	محمد عثمان بن سلیم	۲۰
یومِ پاکستان (نظم)	افشاں بشیر	۲۴
چراغ تلے	نائلہ صدیقی	۲۶
مقابلہ معلوماتِ عامہ	ادارہ	۳۳
تاریخ ساز دن	محمد انعام	۳۴
استنبول (مسجدوں کا شہر)	الطاف حسین	۳۸
صبحِ آزادی (نظم)	عنبر چغتائی	۴۲
محمد عادل منہاج کیا کہتے ہیں	محمد عمر احمد خان / سیما صدیقی	۴۴
زندہ زمین	محمد عادل منہاج	۴۸
ڈائنوسارز کی حکومت	محمد سعید احمد خان	۵۶
جاؤ نوکری کرو	الطاف حسین	۶۱
محبت روشنی ہے (نظم)	شاہدہ صدف	۶۶
ناقابلِ یقین	ایم اعجاز احمد	۶۸
ہنستے ہنستے	منتخب لطائف	۶۹
پومی اور پونی کی کہانی	محمد شہزاد خان کستوری	۷۴
ہم جشن منائیں گے	عبدالقادر	۷۸
سب سے بڑی ضرورت	شیخ عاکف حمید	۷۹
ہیمپٹن کورٹ کی بھول بھلیاں	غلام عباس طاہر	۸۲
ہوائیوں کہ	قارئین	۸۴
صرف ایک سیکنڈ میں	عابدہ قریشی	۸۹
ایک پرانی کہانی	مہوش سکندر	۹۱
اخبار آنکھ مچولی	لعل بخش	۹۴
بنام آنکھ مچولی	قارئین کے خطوط	۹۵
بلب کی ایجاد	عبدالستار خان طاہر	۱۰۰
قلم دوست	نئے ادیب	۱۰۷

سنہرے حروف

محمد سلیم امام، متحدہ عرب امارات

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت خدا ترس دین دار اور بندوں سے محبت کرنے والے اُموی خلیفہ گزرے ہیں۔ ان کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کا نگ اتنا قیمتی تھا کہ جوہری اس کی قیمت لگانے سے قاصر تھے۔

ایک بار ملک میں سخت خُشک سالی ہوئی اور لوگ بڑی مصیبت میں مُبتلا ہوگئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بیت المال کا منہ کھول دیا اور محتاجوں کی امداد کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی انگوٹھی اُتار دی۔ پھر حکم دیا کہ اسے فروخت کردیا جائے اور جس قدر رقم حاصل ہو اسے ضرورت مندوں اور مسکینوں میں تقسیم کردیا جائے۔ انگوٹھی کا نگ فروخت ہوگیا اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سات دن تک ملک بھر کے محتاجوں اور مسکینوں میں بٹتی رہی اور وہ نہال ہوگئے۔

ایک شخص نے خلیفہ وقت سے کہا۔ "یہ آپ نے کیا کیا۔ اس انگوٹھی کا نایاب نگ اب ہاتھ نہ آئے گا۔" حضرت عمرؒ نے یہ سنا تو آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا :

"یہ بات خدا کو کیسے پسند آسکتی تھی کہ لوگ بھوکے مر رہے ہوں اور میں قیمتی انگوٹھی ہاتھ میں پہنوں اللہ نے تو مجھ پر لوگوں کی نگہداشت اور خدمت فرض کی ہے۔"

پہلی بات

مدیرِ آنکھ مچولی

اپنا گھر کسے پیارا نہیں۔ سب کو اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے۔ گھر ہمیں گرمی، سردی، آندھی اور بارش سے بچاتا ہے...... گھر کو سجانا سنوارنا اور اس کی حفاظت کرنا گھر کے ہر فرد کی ذمّہ داری ہے۔ یہ ذمّہ داری احسن طریقے سے اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب گھر کے لوگ ایک ہوں، ان میں محبّت ہو اور سب ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوں۔

جس گھر میں محبّت ہوتی ہے۔ وہاں اتّفاق ہوتا ہے، جہاں اتّفاق ہو وہاں اعتماد ہوتا ہے اور جہاں اعتماد ہو وہاں انصاف ہوتا ہے اور وہیں ترقی ہوتی ہے ایسے گھر میں کبھی جھگڑا نہیں ہوتا اور کبھی کوئی تکلیف دہ صورتحال رونما نہیں ہوتی۔ ایسا گھر مضبوط، مستحکم اور خوشحال ہوتا ہے اور اس خوشحال گھر کو باہر کا کوئی دشمن نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

پاکستان بھی ہمارا گھر ہے۔ اسے سجانا، سنوارنا، اور مستحکم بنانا ہماری ذمّہ داری ہے......

جب ہمارا گھر نہیں تھا تو لاہور کے منٹوپارک میں ایک قرار داد منظور کی گئی تھی جہاں انصاف والے ایک پُرسکون گھر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہونے والی اس قرارداد نے ایک نئے گھر کی بنیاد رکھی تھی اور برصغیرپاک و ہند کے مسلمانوں نے جان و مال، عزّت و آبرو کی قُربانی دے کر ایک پیارا گھر حاصل کیا تھا، پاکستان بنا تو سارے مسلمان مُتحد تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اتّفاق، محبّت .... انصاف، اخوّت، اعتماد اور انصاف کی کمی ہوتی گئی۔ لوگ آپس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کا ایک حصّہ ہم سے جُدا ہو گیا۔ خیال تھا کہ کمزور ہونے کے بعد ہم سبق سیکھیں گے اور آئندہ کی غلطی کو نہیں دہرائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج بھی ہم کسی کو اس کا حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ جھگڑوں اور انتشار میں ہماری زندگی بسر ہو رہی ہے۔ آئے دن کے ہنگاموں اور جھگڑوں سے اپنے لوگوں کا ہی نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان گھر کو پہنچ رہا ہے۔ سوچئے گھر نہیں ہو گا تو ہم چین و سکون سے کیسے رہ سکیں گے؟ کون ہمیں جانے گا......؟" یاد رکھئے! اس گھر سے ہی ہماری شناخت ہے۔ اس گھر کو کچھ ہوا تو ہماری شناخت مِٹ جائے گی۔ اس میں امن و سکون قائم رکھنا ہے اور اسے مستحکم بنانا ہے تو محبّت، اخوّت، رواداری، اتّفاق اور بھائی چارگی کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور ہر فرد کو اس کا حق دینا ہو گا۔

اپنے گھر کی حفاظت، اس میں امن و سکون قائم رکھنا.... اور قرار دادِ پاکستان سے تجدید عہد کا اوّلین تقاضا یہی ہے!!

حمدِ باری تعالیٰ

شاعر : صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

تُو زمین، آسمان کا مالک — ساری دُنیا جہان کا مالک
میرے تن، میری جان کا مالک

آسماں پر جو چاند تارے ہیں — تُو نے یہ نقش سب سنوارے ہیں
تیری قُدرت کے سب نظارے ہیں

بُھولے بھٹکوں کا رہنما تُو ہے — نا اُمیدوں کا آسرا تُو ہے
سب کے دُکھ درد کی دوا تُو ہے

اپنے دُکھ سب تُجھے سُناتے ہیں — تیرے آگے ہی سر جُھکاتے ہیں
تُجھ سے دِل کی مُراد پاتے ہیں

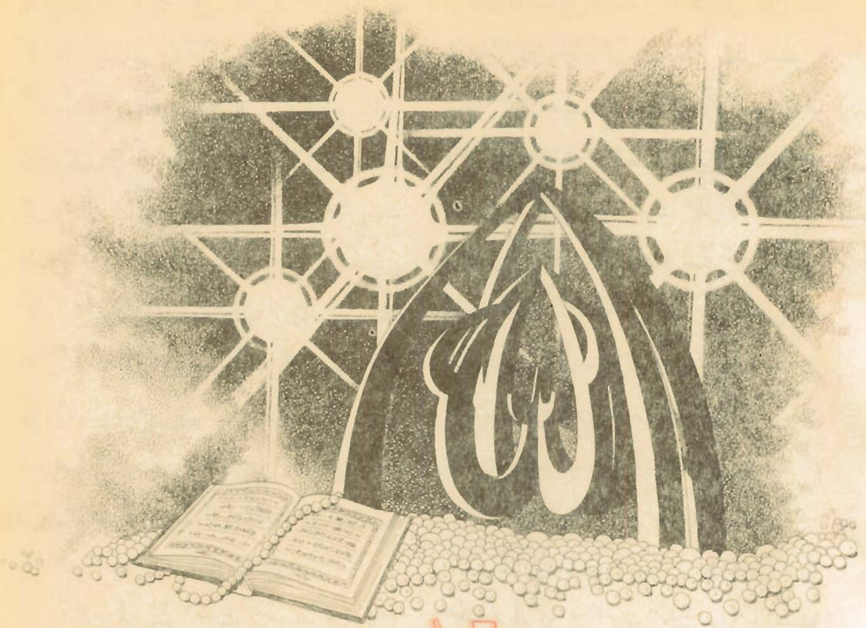

اللہ ان سے راضی ہو

سہیل عباسی

حضرت بلالؓ اُمیہ بن خلف کے غلام تھے اور حبشی نسل سے تھے۔ مؤذن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ جب ان کے مسلمان ہونے کی خبر اُمیہ کو ہوئی تو اس نے انہیں قسم قسم کی تکلیفیں دینی شروع کیں۔ جب ریت آگ کی طرح گرم ہوجاتی تو انہیں ننگی پشت کر کے لِٹا دیا جاتا پتھر کی وزنی اور موٹی سِل چھاتی پر رکھ دی جاتی جس سے پُشت جل جاتی اور اس میں آبلے پڑجاتے، اسلام سے باز آنے کے لئے کہا جاتا مگر آپ جب اذیتوں کے بعد ہوش میں آتے تو "احد احد" پکارتے جس پر اُمیہ دیوانہ ہوجاتا اور اپنی اُنگلیاں چبا ڈالتا۔

حضرت زبیرؓ (مشہور صحابی گزرے ہیں) کے چچا کو جب ان کے مسلمان ہونے کی خبر ملی تو سخت غصہ کی حالت میں ان کے سر کے بال پکڑتے ہوئے دریافت کیا "بد بخت! کیا تو بھی مسلمان

ہو گیا ہے؟" حضرت زبیرؓ نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ یہ سُننا تھا کہ چچا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حضرت زبیرؓ کو کس کر باندھ دیا اور چٹائی میں لپیٹ کر اونی کپڑے کی مشعل سے ناک میں دھواں دینا شروع کردیا جب آپ دھوئیں سے منہ دوسری طرف پھیرتے تو ظالم چچا سر کے بال پکڑ کر ناک دھوئیں کے قریب کردیتا۔ آپ بے ہوش ہوگئے اور آپ کے کپڑے جل گئے پر ظالم چچا باز نہ آیا۔ دینِ الٰہی سے سرشار ان دو ہستیوں کے بعد، جنہیں قبولیت اسلام پر زدوکوب کیا گیا وہ حق پر ثابت قدم رہے اور سختیاں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں، اب مزید دو کا حال پڑھیے۔

قریشِ مکہ نے حضرت صہیبؓ کو اسلام قبول کرنے کے بعد رسیوں سے جکڑ کر سخت گرم ریت پر چت لٹا دیا اور ان کے سینے پر دو قوی ہیکل جوان کھڑے انہیں مارتے جاتے اور خدا کے نام سے انکاری ہونے کو کہتے جاتے تھے۔ آپؓ سخت تکلیف میں تھے اور کہتے جاتے تھے "اسلام نہ چھوڑوں گا، جان چھوڑ دوں گا" یہ بات سن کر قریش غضبناک ہوگئے پتّھروں سے سر کچلنا شروع کردیا۔ خون کا پرنالہ جاری ہوگیا۔ آپ نے پانی مانگا کسی نے رحم نہ کھایا، اور بے ہوشی کی حالت میں بھی ظلم و ستم سے باز نہ آئے۔

حضرت عُثمانؓ کے چچا کو جب علم ہوا کہ آپ مُسلمان ہوگئے ہیں تو غصّے کی حالت میں عُثمانؓ سے پوچھا "عُثمان! کیا تو محمدؐ کے خُدا پر ایمان لے آیا ہے؟" عثمانؓ نے جواب دیا "جو کچھ آپ نے سُنا بالکل درست ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے" ان کے چچا کو طیش آگیا حضرت عُثمانؓ کو کھجور کی رسیوں میں جکڑ کر دُرّے مارنے شروع کیے۔ چمڑے کا دُرّہ جسم کے جس حصّہ پر پڑتا کھال اُتار دیتا۔ بدن زخموں سے چور ہوگیا اور جسم کے ہر حصّہ سے خون جاری تھا۔ یہاں تک کہ آپ بے ہوش ہوگئے۔ بے ہوشی کی حالت میں چچا کے حکم سے کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ دوسرے دن پھر انہیں نکالا گیا۔ پھر زدوکوب کرنا شروع کیا آخر چچا تھک کر ہار گیا مگر حضرت عُثمانؓ نے اسلام سے انکار نہ کیا۔

تاریخِ اسلام میں صرف ایک دو نہیں سینکڑوں واقعات ایسے ملیں گے جب حق پر چلنے والوں کو حق سے روکنے کے لئے ان پر ظلم وجور کیا گیا، مارا پیٹا گیا، اذیتیں پہنچائی گئیں، اللہ رسولؐ کے پروانوں نے شمع حق کی خاطر سر کٹانا تو منظور کیا لیکن باطل کے آگے کبھی سر نہیں جُھکایا۔ جنہوں نے حق کو پالیا اور اس پر ثابت قدم رہے۔ اللہ ان سے راضی ہو!

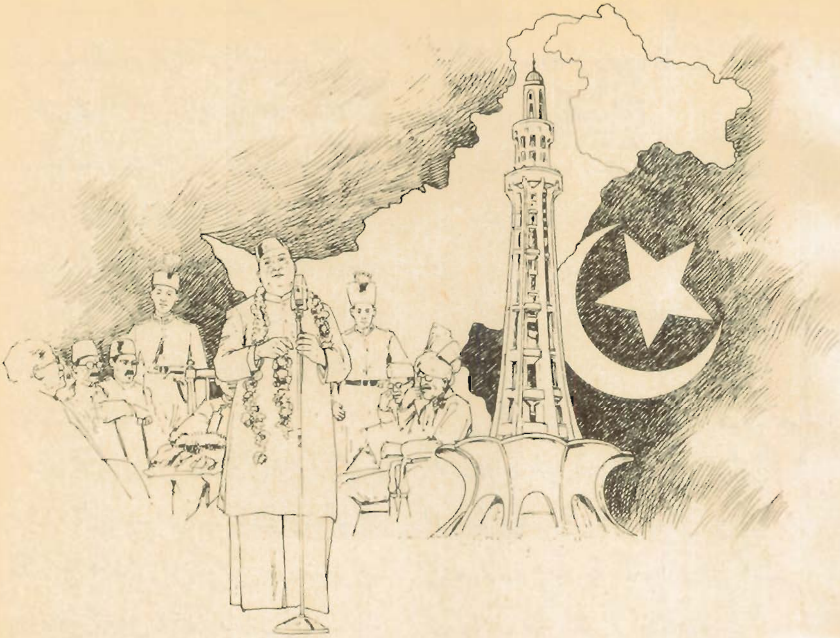

تلاش

محمد جاوید خالد

یوں تو وہ عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہی تھی مگر خاص بات یہ تھی کہ وہ ادیب تھی، بہت بڑی ادیب، تجسّس اس کی طبیعت کا حصّہ تھا۔ مشاہدے کی قوت قدرت نے اسے عطا کی تھی اور مطالعہ اس کے معمول میں شامل تھا۔ ان تمام چیزوں نے مل کر اسے اتنی بڑی ادیب بنا دیا تھا کہ اس کی تحریریں ساری دُنیا کے سنجیدہ علمی حلقوں میں اہمیت رکھتی تھیں۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کی اہمیت تھی اور اس کی تحریریں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی تھیں۔

ایک دن اس کے مشاہدے میں ایک عجیب و غریب قوم آئی۔ وہ قوم جو بادشاہ تھی مگر غلام بن گئی۔ جو حاکم تھی مگر محکوم بن گئی۔ جو ظالموں کا شکار ہو کر ایسی مظلوم بن گئی کہ اس کا نام و نشان

ختم ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن...... لیکن وقت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اس نے دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ ہر نگلنے والے منہ کے لئے لوہے کا چنا بن گئی۔ پھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی پھر اس نے اپنی حیثیت منوالی پھر ...... مگر اس پھر سے پہلے اس نے طے کیا کہ وہ اس قوم کا آغاز سے مطالعہ کرے گی کیونکہ یہ ساری بات سخت حیران کن ہی نہیں بہت دل چسپ بھی تھی۔

وہ چل پڑی اس نے گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے سامنے ایک لمبا سفر تھا، تاریخ کا سفر اور اس کی منزل ہندوستان تھی۔ ہندوستان کہانیوں کا خطّہ، عجائبات کی دُنیا۔ ابھی اس کا سفر کچھ زیادہ نہ ہوا تھا کہ ہندوستان کے گلی کوچوں سے اُٹھنے والے ایک شور نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ کچھ لڑکے تھے۔ ہٹے کٹے، صحت مند، بھڑکیلے لباس پہنے ہوئے جو مل جل کر نعرے لگا رہے تھے۔

ایک روپیہ چاندی کا

راج مہاتما گاندھی کا

ابھی وہ یہ نظارہ دیکھ ہی رہی تھی کہ تاریخ کے صفحات تیزی سے پھڑپھڑائے۔ کئی صفحے ایک ساتھ آگے کی طرف اُلٹ گئے۔ وہ ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ سادہ لباس میں بہت سے لڑکے سُرخ چہروں کے ساتھ ہاتھ فضا میں بُلند کرتے دکھائی دیے۔ وہ بھی نعرے لگا رہے تھے۔ گلے پھاڑ کے پوری قوت کے ساتھ

بٹ کے رہے گا ہندوستان

لے کے رہیں گے پاکستان

اور

پاکستان کا مطلب کیا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

یہ منظر اسے پیچھے جانے سے روک رہا تھا۔ مگر اسے اپنا سفر یاد تھا۔ "یہاں میں پھر آؤں گی" اس نے سوچا اور چل پڑی۔ وہ چلتی رہی پیچھے اور پیچھے۔ لوگ کم ہوتے گئے۔ تہذیبوں کا نشان اوجھل ہوتا رہا۔ خطّے غیر آباد ہوتے گئے اب وہ ایک ایسی جگہ پر تھی کہ اس کے ایک ہاتھ پر سمندر تھا اور دوسری طرف آبادی۔

اس آبادی کے دو طبقے تھے۔ امیر اور غریب۔ ظالم اور مظلوم مگر اکثریت مٹی کے بنائے ہوئے بتوں کے آگے جھک رہی تھی۔ اسے ان لوگوں کی حالت پر بہت ہی ترس آیا جو سخت مفلوک الحال تھے۔ ظلم و جبر نے ان کی آنکھوں سے اُمیدیں چھین کر ان کی کمروں کو دہرا کردیا تھا اور وہ فریاد کس سے کر رہے تھے مٹی کے ان بتوں سے جو اپنی جگہ سے خود جنبش تک نہ کرسکتے تھے۔ مگر وہ قابل رحم تھے اپنے ظالم حاکموں کے

خلاف فریاد کا انہیں یہی ایک راستہ معلوم تھا۔

سمندر میں ہلچل ہوئی تو اس کی نگاہیں آبادی سے ہٹ کر سمندر کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس نے ایک نو عمر سپہ سالار کو دیکھا۔ جس کا چہرہ عزم و جرأت سے تمتمارہا تھا۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی تھی اور اس نوجوان کا نام محمد بن قاسم تھا جو راجہ داہر کو سزا دینے ملک عرب سے آیا تھا۔ سزا اس جرم کی جو اس نے مسلمان تاجروں کے جہاز کو لوٹ کر کیا تھا۔ اس نے لوٹ ہی نہیں مچائی تھی بچّوں اور عورتوں کو یرغمال بھی بنالیا تھا۔ پھراس جُرم پر کسی معذرت سے صاف انکار کردیا تھا۔ یہ پُرعزم نوجوان فاتح ثابت ہوا۔ لیکن اصل فاتح تو اس کا کردار تھا۔ اس کی دل جوئی تھی جس نے دُکھی لوگوں کے دل میں اپنے گھر بنالئے اور جس نے ان کی آنکھوں کے سارے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں بُتوں سے فریاد کرنے والے خدائے بزرگ و برتر سے مدد مانگ رہے تھے۔

ہندوستان کی تہذیب عجیب تہذیب تھی' بلکہ عجیب و غریب لیکن سخت طاقتور بھی۔ ہر نئی تہذیب کو اپنے اندر ضم کرلینے والی۔ لیکن یہ جو نئی تہذیب آئی تھی، مُسلم تہذیب' اس کے انداز ہی الگ تھے۔ بالکل منفرد اور پرکشش اپنا وجود پوری آب و تاب کے ساتھ منوانے والی مُسلم تہذیب ہندوستانی تہذیب سے بھی زیادہ طاقتور تھی کیونکہ اس میں کوئی بات غیر فطری نہ تھی اس کی سچائیوں نے ہندو تہذیب کے نگرانوں کو چونکا دیا لیکن بجائے اس کے کہ وہ سر کی آنکھوں سے دیکھ کر دل کی گہرائیوں سے سوچتے وہ اس کے دشمن ہوگئے۔ اس کے خلاف انہوں نے اپنے دل میں کچھ جمع کیا تو صرف کینہ' حسد' غصّہ مگر فطری چیز کو تو بڑھنا تھا چنانچہ مُسلم تہذیب بھی بڑھتی گئی یہ الگ بات کہ اس کے خلاف غصّے اور حسد کا ایک طوفان بھی جمع ہونا شروع ہوگیا۔

مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہے تھے وہ دیکھتی رہی۔ نہایت محویت کے ساتھ دیکھتے ہوئے بھی وہ ایک ایک چیز کو نوٹ کرتی رہی۔ اب سولھویں صدی تھی۔ اس خطّے پر مُسلمان بادشاہوں کا دور شروع ہوچکا تھا۔ یہ حکمران کیسے بھی رہے ہوں گے مگر رواداری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ حسد' نفرت' کینہ ان سب کے جواب میں مل جل کر رہنے کا جذبہ ان کے دلوں میں موجود تھا اور اس وقت اکبر بادشاہ تھا۔ رعب و دبدبہ اور اختیارات و طاقت میں سب بادشاہوں میں منفرد اس کی رواداری اتنی بڑھی کہ اس نے ہندومت اور اسلام کو غلط سلط کر کے "دین الٰہی" بنادیا۔ حسد اور کینہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور اگرچہ یہ خود مُسلم تہذیب کے لئے سخت

اذیت ناک دور تھا۔ خوشبو کو زبردستی ایسی جگہ پر قید کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ جہاں صرف کانٹے اُگتے تھے۔ بنجر ویران اور تکلیف دہ جگہ اور یہ کام ایک مُسلمان ہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا' مگر طاقتور بادشاہ کے سامنے دم مارنے کی مجال کسی کو نہ تھی۔ لیکن یہ مجال بھی جلد ہی اس کے سامنے آگئی۔ ایک خوبصورت نورانی چہرہ جس پر جلال کی سرخی نے اسے نہایت قابل احترام بنادیا تھا۔ اس کی آواز دربار شاہی میں گونجی۔ "مُسلم اپنی تہذیب' تعلیم' افکار' کردار ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہے۔ اسے کسی ایسی قوم میں مدغم نہیں کیا جاسکتا جو ہر لحاظ سے اس سے الٹ ہو اور پھر اس کے ختم کرنے کے درپے بھی۔"

یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ جن کو سزا بھی ملی' زنجیریں بھی ڈالی گئیں' قید بھی ہوئے مگر وہ "مُسلم قومیت" کے تصوّر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو ماننا پڑا اور تجربے نے بھی ثابت کیا کہ وہ غلطی پر تھا۔

سمندر ہی کے راستے اس نے تجارت کے لئے سفید چمڑی کے لوگوں کو آتے دیکھا۔ یہ انگریز تھے۔ تاجر کم شاعر زیادہ۔ عیار ہاتھ آگے بڑھا تو ہندو نے بڑھ کر تھام لیا۔ دونوں مل کر چلے تو خود مسلم قوم میں بھی مفادات کے سوداگر انہیں مل گئے۔ پھر سراج الدولہ عزم کے گیت گاتا ہی رہا اور ٹیپو سلطان رزم میں للکارتا ہی رہا مگر ان کا خون بھی مُسلم قوم کو غلام بننے سے نہ روک سکا۔ دشمن سارے متّحد ہوچکے تھے۔ انگریز آیا اور چھاگیا ہندو مسلمان سے اپنی غلامی کا انتقام لینے پر تُل گیا اور مُسلم مِٹنا شروع ہوگیا معاشرتی طور پر اس کی حیثیت دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی ہوگئی۔ معاشی طور پر اس کی دولت' اس کی جائیدادیں اس کے دشمنوں میں بٹ گئیں۔ اس کی زندگی ٹیکسوں کی نذر ہوگئی۔ درگاہ ٹیکس' پوجا ٹیکس' یہاں تک کہ داڑھی ٹیکس بھی اسے دینا تھا۔ سیاسی طور اس لئے ختم ہوا کہ جدید تعلیم سے محروم تھا۔

یہ انیسویں صدی تھی۔ دشمن اگرچہ حد درجہ عیّار تھے اور متّحد بھی لیکن مٹتے مٹتے اس مُسلم کو ایک اور سہارا ملا۔ اپنی ذات سے بلند ہو کر قوم کے لئے سوچنے والے اس محسن کا نام سیّد احمد خان تھا۔ قابل ایسے کہ انگریز نے "سر" کا خطاب دیا اور سرسید کہلائے۔ اس جواں مرد نے ڈوبتی قوم کا نہ صرف ہاتھ پکڑا بلکہ اسے ذلّت کے سمندر سے باہر نکالا' اسے سنوارا' اسے بنایا۔ یہاں تک کہ اسے اس قابل کردیا کہ وہ اپنے دشمنوں کے کندھے سے کندھا مِلا کر کھڑا ہوسکے۔ اسی بزرگ کی کوششوں سے مُسلم نوجوان جدید تعلیم سے آراستہ ہوئے لیکن نئے دور نے ہتھیار

بھی نئے دیئے تھے اور لڑائی پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک ہو گئی کیونکہ دشمنوں کے دل صاف تو ہوئے ہی نہیں تھے۔ اب لڑائی نظریات کی لڑائی تھی اور گندے نفرت بھرے ذہنوں میں مکروہ سازشیں تیار ہو رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں بھی اسی ہندوستان میں چلتے دیکھیں۔ جن کا کام تھا کہ ہندوستان سے مُسلمان ختم کر دیئے جائیں وہ رہیں تو صرف ہندو بن کر۔ اس نے واردھا کی تعلیمی اسکیم دیکھی جس کے تحت اسلام کی تعلیم کو مٹایا جارہا تھا۔ اس نے ہندوؤں کی سیاسی پارٹی کانگریس کا راج دیکھا جس کے دور میں مُسلمان کو کوئی مراعات دینے سے صاف انکار تھا۔ یہ سب کارروائیاں یک طرفہ تھیں۔ مُسلمانوں کا ہر بڑا رواداراس کے ساتھ مِل جُل کر رہنا پسند کر رہا تھا۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی، حتیٰ کہ مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کو بھی اس نے سُنا تو یہ کہتے ہوئے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہی نازک ترین دور آگیا۔ جو اس نے شروع میں دیکھا تھا۔ ہندو اور سکھ لڑکے اور ہندو راج کی باتیں۔ حضرت مجدّد، ٹیپو سُلطان، اور سرسیّد کی قوم ایک دفعہ پھر تباہی سے دور چار تھی۔ مگر اب کے تباہی بڑی خوفناک نظر آرہی تھی۔ دشمنوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور وہ کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سب متّحد تھے اور یہاں خود مُسلمانوں میں انتشار ہی انتشار تھا۔ قدرت نے ایک دفعہ اور رحم کیا۔ اب کے اس کشتی کے ناخدا کا نام تھا محمد علی جناحؒ۔ مُسلمانوں کا یہ رہنما تو بہت عجیب تھا نہ اس کے پاس دینی تعلیم تھی نہ حُلیہ مسلمانوں جیسا تھا لیکن اس کے پاس ایک دولت اتنی بڑی تھی کہ جس کی کوئی مثال نہ تھی، خلوص سچائی اور محنت کی دولت اس نے اپنی قوم کو پہلا اور آخری سبق یہ دیا کہ "تم ایک قوم ہو الگ طور پر مکمل قوم جو ہندو تہذیب سے بالکل الگ ہے۔" اس نے یہ سبق اتنی دردمندی اور خلوص سے پڑھایا کہ پھیلے ہوئے ہندوستان میں ہر رنگ اور ہر لباس کے مُسلمان کو یاد ہو گیا۔ وہ سب چل پڑے۔

یہ بیسویں صدی تھی۔ وہ سب لاہور میں جمع تھے۔ سانولے، اُجلے، کالے سب پاجاموں، شلواروں، دھوتیوں میں ملبوس وہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ بہت سوں کی زبانیں اور لہجے بھی مختلف تھے۔ "کیا چاہیئے؟" اس نے ایک سے پوچھا۔ "کیا مطالبہ ہے؟" اس نے دوسرے کو نے یہ سوال کیا۔ "کیا مانگتے ہو؟" وہ بچوں اور عورتوں کے قریب جانکلی سب کی زبان پر ایک ہی جواب

☆ اطمینان قدرتی دولت ہے اور بے اطمینانی جعلی سکے۔
☆ دوستوں کو کھو دینا سب سے بڑی غریبی ہے۔
☆ بچے سچائی کا دوسرا نام ہیں۔
☆ لالچ کرنا مفلسی، بے غرض ہونا امیری اور معاف کر دینا صبر ہے۔

تھا۔ "پاکستان" ان کا کہنا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں۔ ہمارا ایک ملک ہونا چاہئے یعنی "پاکستان" ان میں سے ایک نے قرار داد پیش کی اور اس کی حمایت میں اتنے ہاتھ بلند ہوئے کہ اس کے لئے گننا ممکن ہی نہ رہا۔ قرار داد تھی "پاکستان" اور لاتعداد اُٹھنے والے ہاتھ بھی یہی کہہ رہے تھے۔ "پاکستان"

اس لمبے سفر نے اسے تھکا دیا تھا لیکن اس کی دلچسپی کم نہ ہوئی تھی۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا تو تیز ہوا نے کئی صفحے پھر ایک ساتھ پلٹ دیئے۔ دنیا کی منفرد تحریک ان گنت جانوں کا، گھروں کا، کنبوں کا نذرانہ دے کر کامیاب ہو چکی تھی۔ پاکستان بن چکا تھا، قوم کے قائداعظم انتقال کر گئے تھے اور پھر...... اُف...... یہ کیا اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ خوفناک سچائی اس کے سامنے موجود تھی۔ کل کے ہارے ہوئے دشمن پھر سے زندہ ہو گئے تھے۔ ایک محاذ پر شکست کھا کر انہوں نے کئی محاذ کھول لئے تھے۔ انہوں نے ایک قوم کو کئی قوموں میں اور ایک ملک کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ وہ نڈھال ہو گئی اسے اس قوم پر افسوس تھا جس کی قدرت نے بار ہا مدد کی تھی مگر جو دشمنوں کی نذر ہو گئی۔ یہ چہرے اس کے دیکھے بھالے تھے جو اب اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس نے ایک شخص کا دامن پکڑلیا۔ "تم پاکستانی ہو؟" اس نے سوال کیا وہ چپ رہا۔ آس پاس بھیڑ لگ گئی اس نے ایک ایک چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم پاکستانی ہو؟" سب چُپ تھے۔ "تم کون ہو؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔ اب کئی آوازیں آئیں۔ میں پٹھان ہوں۔ میں بنگالی ہوں، میں پنجابی ہوں، میں سندھی ہوں، میں مہاجر ہوں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کانوں میں سِسکنے کی آواز آرہی ہو اور جیسے یہ آواز پاکستان کی ہو۔ وہ دیر تک بیٹھی رہی گُم سُم پھر اس نے قلم اُٹھایا اور سوچ سوچ کر ایک جملہ لکھا۔

"آج سے پچاس سال پہلے ایک قوم ایک ملک کی تلاش میں تھی۔ اس نے اسے پالیا لیکن ..... آج پچاس سال بعد ایک ملک ایک قوم کی تلاش میں ہے۔

کیا وہ اسے پاسکے گا ؟"

دوسروں کا حق مارنے والے
کھائیں الیسابیل کے جیسے

انتخاب: عائشہ محبوب

لوگ جینے کے لئے کھاتے ہیں
یہ صاحب کھانے کے لئے جیتے ہیں

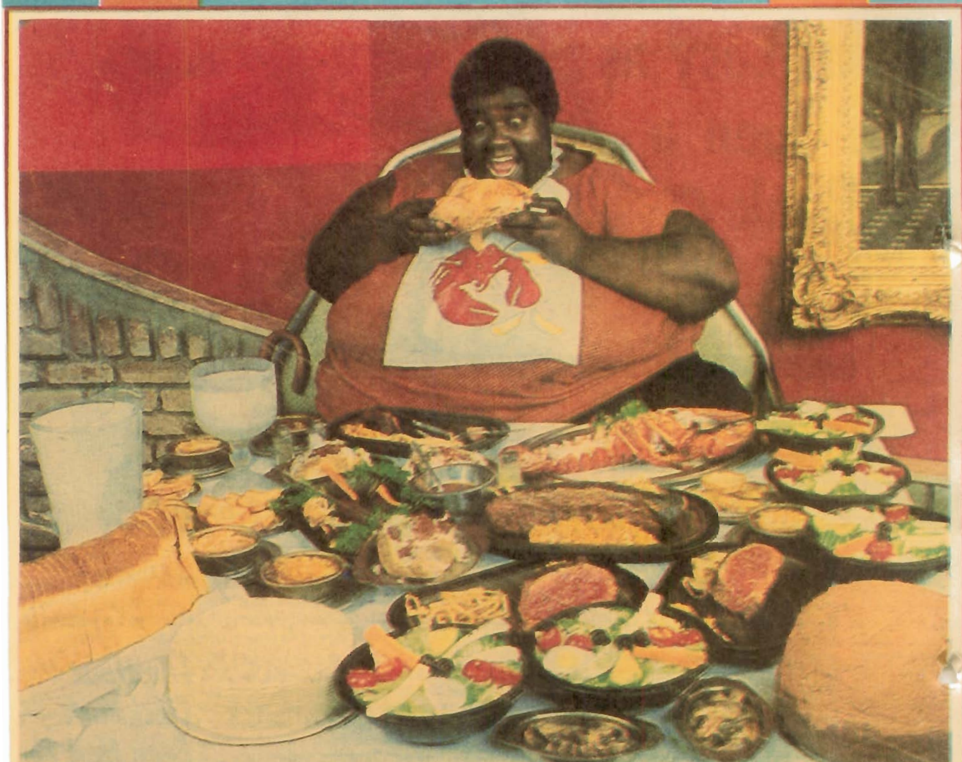

اُداس پرندے

عثمان بن سلیم

جوں جوں جیپ اونچے نیچے راستوں پر اپنا سفر طے کرتی جارہی تھی جنگل گھنا ہوتا جارہا تھا۔ راستہ دونوں اطراف سے درختوں کی شاخوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ان شاخوں کے نیچے سے جیپ دھول اُڑاتی آگے بڑھی چلی جارہی تھی۔

"اب کتنی دیر کا راستہ اور رہ گیا ہے چچا جان؟" علی نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے عزّت جاہ سے پوچھا جو جیپ ڈرائیو کررہے تھے۔ "بس سمجھ لو پہنچ ہی گئے۔"

عزّت جاہ نے کہا کچھ ہی دیر بعد وہ قدرے کھُلی جگہ پر تھے جہاں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ بے شمار اُونچے اُونچے درخت اور پودے لہلہا رہے تھے، پودوں پر جنگلی پھُول کھِلے تھے۔ عزّت جاہ جیپ روک کر نیچے اُتر آئے علی بھی اُتر کر ان کے پاس آکھڑا ہوا۔ وہ اور اس کے چچا بڑی دلچسپی اور محبّت سے اس سرسبز جگہ کو دیکھ رہے تھے۔ منظر بڑا

خوب صورت تھا لیکن اس جگہ عجیب سی ویرانی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں پر سفید رنگ کے بڑے بڑے خوب صورت پرندے بیٹھے تھے۔ لیکن ان کی نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے بسی اور اُداسی تیر رہی تھی۔ علی نے محسوس کیا کہ وہ اُداس ہیں سفید رنگ کے وہ بڑے بڑے سفید پرندے شاخوں پر سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ نہ ہی وہ چہچہا رہے تھے اور نہ ہی اِدھر سے اُدھر اڑتے پھر رہے تھے ۔۔

علی کے چچا عزّت جاہ ملک کے نامور مصوّر تھے اور مصوّری کے کئی بین الاقوامی مقابلے جیت چکے تھے۔ ان کے شہ پاروں کی ملک میں اور ملک سے باہر بڑی دُھوم تھی۔ ان کے شہ پاروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عموماً قدرتی مناظر کو مرکزِ نگاہ بناتے تھے۔ اس کے لئے وہ اکثر مختلف سرسبز مقامات پر نکل جاتے اور مختلف مناظر قدرتی کو کینوس پر منتقل کردیتے۔ لوگوں کو عزّت جاہ کی بنائی ہوئی تصویریں بہت پسند تھیں۔ علی بھی چچا کی تصاویر اور ان کے کام کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ چچا ایزل اور بُرش سنبھال کر نکلتے تو وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑتا۔ چچا بھتیجے سے محبّت کرتے تھے اس لئے کبھی منع نہ کرتے۔ حسبِ سابق اس بار بھی وہ سرسبز پہاڑی علاقے میں علی کو لے کر آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار یہاں آچکے تھے۔ یہ جگہ انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ یہاں کا ہرا بھرا ماحول سفید پرندوں کی میٹھی میٹھی چہکار انہیں بہت پسند تھی ایک عجیب سا سرور اور اطمینان دل کو نصیب ہوتا یوں لگتا تھا جیسے یہ جگہ جنت نظیر ہو۔ اس جگہ انہیں تصویریں بناتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

عزّت جاہ تصویر بنانے کے لئے کسی مناسب جگہ کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔ اسی وقت علی نے سوال کیا۔ "چچا جان یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں کیوں میں خود اس بات پر حیران ہوں۔ حالانکہ اس سے قبل یہاں کبھی اتنی خاموشی نہیں دیکھی۔" عزّت جاہ نے بھی اس خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ وہ بولے "یہ پرندے جو اب درختوں پر سہمے بیٹھے ہیں کُھلی فضا میں اُڑتے تھے، اٹکھلیاں کرتے تھے۔ لیکن آج یہ بڑے ست دکھائی دے رہے ہیں۔" چچا کی بات ختم ہوتے ہی علی نے کہا "سست نہیں بلکہ اُداس، بہت اُداس۔" "تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھتیجے..... اچھا آؤ اب گاڑی سے سامان اُتار لیں۔" وہ بولے اور علی ان کے ساتھ مل کر سامان اُتارنے لگا۔ کچھ دیر تک انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور مناسب سی جگہ تلاش کر کے وہاں سامان رکھ دیا۔

عزّت جاہ نے اپنی پینٹنگ کے لئے اس خوبصورت درخت کو منتخب کیا تھا جس کی گھنی شاخوں نے زمین پر سایہ کیا ہوا تھا اور درخت کے اردگرد بے شمار رنگ برنگے جنگلی پھول کھلے بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔ پس منظر میں چنار کے لمبے لمبے درخت نظر آرہے تھے۔

علی چادر پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز سے بے زاری ظاہر ہو رہی تھی۔ "کیا بات ہے علی؟" "تمہیں جگہ پسند نہیں آئی؟" عزّت جاہ نے اسے اسی طرح خاموش بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔ "نہیں یہ بات نہیں انکل!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "پھر کیا بات ہے؟ آتے ہوئے تم نے جس گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔ اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم میں اب پہلے کی طرح گرم جوشی نہیں رہی شاید؟" عزّت جاہ نے اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ہُوں!!" اس نے اردگرد کے درختوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے ایک لمبی سی ہُوں کی پھر ایک نگاہ ایزل پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"چچا جان کیا آپ ان پرندوں کی تصویر بنائیں گے جو ادھر درخت پر بیٹھے ہیں؟" "بھئی! اُداس پرندے کہاں اچھے لگیں گے!" انہوں نے گردن گھما کر پرندوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کاش! میرے بس میں ہوتا میں ان کی آنکھوں میں ان کا دُکھ پڑھ سکتا۔" علی چادر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر پرندوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

اب عزّت جاہ بھی ایزل اور بُرش چھوڑ کر اس کے پاس آگئے اور اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے بولے۔ "اس وقت تو واقعی تم بھی ایک اُداس پرندے لگ رہے ہو....... جیسے ہی عزّت جاہ نے یہ جملہ کہا اسی وقت اچانک پچھلی طرف سے ایک پرندے کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی اور پھر دوسرے درختوں سے کئی سفید پرندے اُڑے اور...... درخت کے قریب پھڑ پھڑاتے ہوئے ایک عجیب سا شور کرنے لگے۔ دردانگیز شور جسے سُن کر دل کانپ جائے۔ "ان پرندوں کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ تو ہر دم چہکنے والے پرندے تھے۔ عزّت جاہ نے حیرت سے کہا پھر وہ تیزی سے اُٹھ کر اس درخت کی طرف بڑھے جہاں سفید پرندے شور مچا رہے تھے۔ علی بھی ان کے ساتھ تھا۔ جیسے ہی وہ اس درخت کے قریب پہنچے اچانک تین پرندے درخت سے نیچے گرے۔ ان کے جسموں سے خون بہہ رہا تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ تڑپنے لگے اور تڑپ تڑپ کر مرگئے۔ عزّت جاہ اور علی درخت کی شاخوں کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ درخت کے اوپری حصّے میں ایک عجیب سا مضبوط جال لگا ہوا ہے جس میں بے شمار

سفید پرندے قید ہیں اور باہر آنے کے لئے مچل رہے ہیں۔ "اہو! یہ کیا دھرا غالباً" کسی شکاری کا ہے اور جال اس نے ان سفید پرندوں کو پکڑنے کے لئے لگایا ہے۔" عزّت جاہ اوپر دیکھتے ہوئے بولے۔ جال کے آگلے کے حصّے پر لوہے کی بندش تھی۔ بندش کی معمولی سی جگہ کُھلی تھی اور شدید زخمی ہو کر مرنے والے تین پرندے وہیں سے گرے تھے۔ آزادی تو انہیں مل گئی تھی مگر زندگی سے آزادی۔ البتہ ان کے بقیہ ساتھی قید تھے اور جو آزاد تھے وہ باہر درختوں پر بُری طرح بے چین تھے اور ان کی آزادی کے لئے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے جیسے اپنے ساتھیوں کی آزادی کے لئے مدد مانگ رہے ہوں۔ عزّت جاہ تیزی سے پلٹے۔ اپنے سامان میں سے انہوں نے چاقو نکالا، پنڈلی میں اڑسا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے درخت پر چڑھنے لگے۔ علی کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ درخت بالکل سیدھا تھا اس کے چچا گر بھی سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بحفاظت اوپر جال تک پہنچ گئے پھر انہوں نے جال کاٹنا شروع کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد تمام قیدی پرندے آزاد ہو کر کھُلی فضا میں خوشی سے دیوانہ وار چکر لگا رہے تھے۔ ان میں سے جو چند زخمی ہوگئے تھے وہ اب درخت کی شاخوں پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور زخمی ہونے کے

اقوال زریں

○ دشمن سے ہمیشہ بچو اور دوست سے اس وقت جب وہ تمہاری تعریف کرنے لگے۔
(شیخ سعدیؒ)

○ جو اپنوں کے ساتھ وفا نہیں کرتا عقل مندوں کے نزدیک دوستی کے قابل نہیں۔
(شیخ سعدیؒ)

باوجود خوب زور زور سے چہچہا رہے تھے۔ ان کی چہکار بڑی دلفریب تھی کچھ دیر پہلے کی اس ویران جگہ میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ عزّت جاہ نے علی کی طرف دیکھا جو بڑی محویت اور محبّت سے خوش و خرّم پرندوں کو تک رہا تھا"۔ "دیکھا علی آزادی کتنی بڑی نعمت ہے اور پرندوں کو اس کا کتنا احساس ہے ایک ہم انسان ہیں کہ ہمیں اپنے بھائیوں کی آزادی کی کوئی فکر نہیں۔" تب علی نے چونک کر چچا کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ پر بندھی گھڑی میں جہاں ۲۳ مارچ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا اسے یاد آیا کہ آج اسے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے جلسہ میں شرکت کرنی تھی لیکن وہ شرکت اس وقت کرتا ناں جب اسے خود ان کی تکالیف کا احساس ہوتا۔

وہ بہت شرمندہ تھا۔ اسے وہ پرندے بہت اچھے لگے تھے جو اپنے ساتھیوں کی آزادی کے لئے تڑپ اٹھے تھے!!

پھر آیا یومِ آزادی

افشاں بشیر

ہے کتنا سہانا آج سماں
پھر آیا یومِ پاکستاں

یہ تیئس مارچ ہمارا دن
یہ اُجلا اُجلا سارا دن
ہے کتنا مُبارک پیارا دن
اس دن پہ ہزاروں دن قُرباں
پھر آیا یوم پاکستاں

اک خواب کہ جو اقبال کا تھا
وہ خواب بڑا ہی سچّا تھا
دُنیا کے نقشے پہ اُبھرا

اک دیس نرالا عالی شاں
پھر آیا یومِ پاکستاں

ہر ظلم کے بُت کو توڑ دیا
گھر بار وطن سب چھوڑ دیا
تاریخ کا دھارا موڑ دیا
پھر پیش کیا نذرانۂ جاں
پھر آیا یومِ پاکستاں

اس دن کی یاد مناتے ہیں
خوش ہوتے ہیں، سب گاتے ہیں
تاریخ اپنی دہراتے ہیں
ہے شکر خُدا کا وردِ زباں
پھر آیا یومِ پاکستاں

تجدیدِ عہد پھر کرتے ہیں
اس پاک وطن پہ مرتے ہیں
ہم اس سے محبت کرتے ہیں
اس عشق پہ ہے دُنیا حیراں
پھر آیا یومِ پاکستان

چھائی تلے

نائلہ صدیقی

دھوپ اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی مگر "احسان منزل" میں خاموشی چھائی ہوئی تھی کیونکہ ابھی تک یہاں کوئی سو کر نہیں اُٹھا تھا۔ اس گھر میں بسنے والوں کے معمولات مختلف تھے۔ مثلاً دن چڑھے سونا، رات کو دیر تک جاگنا، دن کا بیشتر وقت ٹی وی کے سامنے گزارنا، اسکول کالج سے پے درپے چھٹیاں کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ کاہلی اور بد نظمی بھی اس گھر کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ گھر کے بیشتر کام کاہلی کی نذر ہوجاتے اور جو کام کاہلی کی گرفت سے بچ جاتے وہ بد نظمی کا شکار ہوجاتے۔

اس وقت بھی پانی کی موٹر چل رہی تھی، پانی پائپ سے مسلسل بہہ بہہ کر گلی کو سیراب کررہا تھا مگر کسی کو ہوش نہیں تھا کہ اُٹھ کر بند کردیتا۔ یہ موٹر احسان صاحب نے چلائی تھی پھر وہ اخبار لے کر بستر پر نیم دراز ہوگئے۔ خیال یہ تھا کہ دس

پندرہ منٹ کے بعد موٹر بند کردیں گے مگر یہ خیال ہی رہا۔ وہ اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگے اور تھوڑی دیر میں گہری نیند سوگئے۔ اچانک ایک زور دار دستک نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے جمائی لے کر سر اٹھایا پھر لحاف میں دبک گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ گھر کا کوئی دوسرا فرد اُٹھ کر دروازہ کھول دے گا۔ مگر گھر کے دوسرے افراد بھی یہی سوچ رہے تھے لہٰذا کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر احسان صاحب ہی بھنّا کر اُٹھے اور جاکر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے میاں؟ کیوں ہمارا دروازہ توڑ رہے تھے؟" احسان صاحب تیز لہجے میں بولے۔ "انکل پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے آپ کی ٹنکی سے پانی بہہ رہا ہے۔ یہ دیکھئے گلی کا کیا حال ہوا ہے؟" اس نے گلی کی طرف اشارہ کیا جہاں سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ "ارے بھائی! موٹر بند کرنا بھول گئے۔ بھول چوک تو ہوجاتی ہے آدمی سے۔" احسان صاحب دھیمے پڑگئے۔ "بھول چوک اسے کہتے ہیں جو کبھی کبھار ہو۔ جو روزانہ ہو اسے عادت کہتے ہیں۔" لڑکے نے چبا چبا کر کہا۔ "ارے صاحبزادے! رہنے دو اپنا فلسفہ۔ یہ لیکچر کسی اور کو دینا۔ یہ تو بتاؤ کہ صبح صبح کسی کے دروازے پر جنگلیوں کی طرح دستک دینا کہاں کی تمیز ہے؟" احسان صاحب لال پیلے ہو کر بولے۔ "آپ کے گھر صبح ہو رہی ہو گی۔ ہمارے گھر میں تو دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔" لڑکے نے لاپرواہی سے کہا۔ "اچھا اچھا میاں! معاف کرو، جاؤ اپنا رستہ لو۔" احسان صاحب نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔ "کون تھا یہ بدتمیز؟ ساری نیند خراب کر کے رکھ دی" بیگم احسان کمرے سے نمودار ہوئیں۔ "ارے بھئی محلے کا لڑکا تھا۔" احسان صاحب نے سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ "اوہو آئے بڑے گلی کے ہمدرد! وہاں تو پہلے ہی اتنی گندگی ہے تھوڑا سا پانی ہماری ٹنکی سے گر گیا تو کیا؟ ویسے یہ موٹر کس نے کھولی تھی؟" بیگم احسان کو اچانک خیال آیا۔ "کھولی تو میں نے ہی تھی مگر آنکھ لگ گئی تو ...." احسان صاحب مجرموں کی طرح سر جُھکا کر بولے۔ "اوہو کتنی مرتبہ کہا ہے اتنی فرض شناسی نہ کیا کریں۔ موٹر کھول کر سو کیوں گئے؟ کیا فرشتے آکر بند کرتے؟" وہ ان پر برس پڑیں۔ "بجلی بھی ضائع ہوئی پانی بھی، نیند الگ خراب ہوئی اور محلے والوں کی شکایتیں الگ۔ آپ کے کام تو ایسے ہی ہوتے ہیں، ہر طرف سے نقصان پہنچانے والے۔" بیگم احسان بڑبڑانے لگیں۔ "افوہ مجھے اتنی اچھی نیند آئی تھی، برباد کردی ان محلے والوں نے۔" صبا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ "ہاں اتنے سویرے اُٹھنا تھا تو میں کالج نہ چلی جاتی۔ ہُما بھی آگئی۔ "چلو اب ناشتہ کا کچھ

کرو" بیگم احسان نے بیٹیوں کو کام کی طرف مائل کرنا چاہا "اوہو امی! اتنی سُستی ہو رہی ہے۔ نیند جو پوری نہیں ہوئی۔" صبا نے جمائی لے کر کہا اور کرسی پر ڈھے گئی۔ "میرا بھی سر بوجھل ہو رہا ہے۔" ہُما اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ "تو پھر میں بازار سے حلوہ پوری لے آؤں!" احسان صاحب نے حالات سے منطقی نتیجہ نکالا۔ "بالکل لے آیئے! انتظار کس بات کا ہے؟" بیگم احسان نے کہا اور احسان صاحب گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور فٹ پاتھ پر اپنا سازوسامان سجائے حلوائی کی جانب چلے۔ جہاں پوریوں کے گندھے ہوئے آٹے پر مکھیاں بھن بھناتی رہتی تھیں۔ کچھ مکھیاں حلوائی پر نثار ہوتی رہتی تھیں۔ مگر وہ کوئی نوٹس نہیں لیتا تھا۔ سُوجی کا انتہائی پیلا اور گیلا حلوہ دھول مٹی اور گاڑیوں کا دھواں جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ پوریاں جس گھی میں تلی جاتی تھیں وہ اس قدر بدبودار تھا جیسے براہ راست چربی میں پوریاں تل لی گئی ہوں۔ حلوہ بھی گریس یا پیٹرول سے بنایا جاتا تھا۔ بہرحال یہ صحت بخش ناشتہ احسان صاحب کے گھر والوں کو بہت مرغوب تھا اور ایمرجنسی کی صورت میں جو تقریباً" ہر روز ہوتی تھی، یہی ناشتہ کیا جاتا۔ اس وقت بھی احسان صاحب دکان پر منتظر کھڑے تھے۔ مکھیاں حلوہ پوری چھوڑ کر احسان صاحب پر آبیٹھیں مگر وہ صبر سے کھڑے رہے۔ حلوہ پوری تیار ہونے پر پیسے ادا کرکے گھر کی طرف چلے جہاں سب لوگ بے چینی سے ناشتے کے منتظر تھے۔ اس وقت تک ان کے بیٹے بھی جاگ چکے تھے اور جمائیاں لینے میں بہنوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ناشتہ کرتے کرتے بیگم احسان نے کہا۔ "اب دیکھنا' یہ ناشتہ کرکے پیٹ بالکل بھر جائے گا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کا تو دل ہی نہیں چاہے گا۔ کیوں بچو؟" انہوں نے بچوں کو دیکھا۔ "جی امی!" بچوں نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

"اچھا تو دوپہر کا کھانا تو نہ پکاؤں نا چلو جیسے تم لوگوں کی مرضی۔" بیگم احسان نے اطمینان سے کہا۔

"ارے ابو! کل میں تو شاید اسکول نہ جاسکوں مگر آپ صبح اُٹھ کر میری اسکول وین کے ڈرائیور کو فیس ضرور دیجئے گا۔ بڑا نک چڑھا ہے ہمارا وین ڈرائیور۔" عمران نے اچانک چونک کر کہا۔

"ارے بیٹا! تم یہ وین چھڑوا کیوں نہیں دیتے؟ دیکھو ناں تم مہینہ میں چار پانچ دن اسکول جاتے ہو۔ اب یہ مہینے بھر کی فیس تو بالکل مفت لوٹ کر لے جاتا ہے ناں وین والا۔" بیگم احسان نے کہا۔

"بیگم! اگر وین چھڑوا دی تو یہ پانچ دن بھی اسکول نہیں جائے گا۔ تم کیا چاہتی ہو' ہمارا بیٹا جاہل رہ جائے؟" احسان صاحب نے کہا۔ "وہ میں کیوں یہ چاہوں گی؟ میں کیا اس کی دشمن ہوں۔ عمران

بیٹا! دیکھو کل اسکول چلے ہی جاؤ۔ کافی دن ہو گئے ہیں۔ دیکھ کر آؤ تو سہی اسکول میں کیا ہو رہا ہے؟" بیگم احسان نے اسے چمکارا۔ "اس کے اسکول میں سالانہ فنکشن ہونے والا ہے' اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں' اس کا دوست ظفر ملا تھا مجھے کل' وہی بتا رہا تھا" ذیشان نے بتایا۔ "ارے فنکشن! واہ مزا آ گیا۔ اب تو کل میں ضرور جاؤں گا اور فنکشن ہونے تک روزانہ جاؤں گا۔ میں ڈانس آئٹم میں حصہ لوں گا۔" عمران پُر جوش ہو گیا۔ "ارے بیٹا! تم پندرہ دن سے اسکول نہیں گئے۔ اب کل جاکر ناچنے لگو گے تو استاد تمہاری خبر نہ لیں گے؟" بیگم احسان نے حقائق کی طرف توجہ دلائی۔ "اوہو بھئی مسئلہ کیا ہے؟ اپنے اعجاز ماموں سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لے لینا کسی پندرہ روزہ بیماری کا اور درخواست کے ساتھ پیش کر دینا۔" احسان صاحب نے کہا۔ "ارے کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں ان لوگوں سے کہ تم سب اپنے لئے دس بارہ سرٹیفکیٹ بنوا کر رکھو' جب ضرورت پڑی پیش کر دیا۔ مگر تم لوگوں کو اتنی توفیق کہاں! ہر کام عین وقت پر کرتے ہو۔ اب شام کو اعجاز بھائی سے سرٹیفکیٹ ضرور بنوا لانا۔" بیگم احسان نے کہا۔

اعجاز صاحب اپنے گھر کے ایک تنگ و تاریک کمرے کو کلینک کا درجہ دے کر خود ڈاکٹر کے رتبہ پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کے پاس ایک اسٹیتھسکوپ اور ایک لیٹر پیڈ تھا جس پر وہ اپنے بھانجے بھانجیوں کو میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرتے تھے۔ انہوں نے دس سال تک ایک ڈاکٹر کے یہاں بطور کمپاؤنڈر ملازمت کی تھی لہٰذا اب ان کی کلینک کے بورڈ پر جلی حروف میں "دس سالہ تجربہ" کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ عمران جب ان کے پاس پہنچا تو وہ سر پکڑے بیٹھے تھے۔ "کیا ہوا ماموں! خیریت؟ کوئی مریض فوت ہو گیا کیا؟" اس نے پوچھا۔ "ارے فوت تو تب ہوں گے جب میرے پاس آئیں گے' میں کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔" اعجاز صاحب نے بھنّا کر کہا۔ "کس وجہ سے؟" اس نے پوچھا۔ "ارے میرا کمپاؤنڈر بھاگ گیا۔" انہوں نے دُکھ سے کہا۔ "تو کیا ہوا؟ دوسرا رکھ لیں۔" عمران نے تسلّی دی۔ "ارے وہ کم بخت میرا بورڈ بھی تو لے بھاگا ہے۔" انہوں نے روہانسے انداز میں کہا۔ "کیا؟" عمران بھونچکا رہ گیا۔ "ہاں اب دیکھنا! کہیں کلینک کھولے بیٹھا ہو گا دس سالہ تجربہ کے ساتھ" انہوں نے آہ بھری۔ "اچھا ماموں! صبر کیجئے۔ ہم آپ کے لئے نیا بورڈ بنوا دیں گے۔ بس اب آپ مجھے جلدی سے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دیجئے۔ کسی اچھی سی بیماری کا۔" عمران نے مطلب کی بات کی۔ "اچھا! ابھی لو۔" اعجاز

صاحب نے قلم اُٹھایا۔
"افوہ بدبو سے دماغ پھٹ رہا ہے، آخر یہ کس چیز کی بو ہے؟" احسان صاحب نے چلا کر کہا۔ "کچرے کی ہے جو ہمارے کوڑے دان سے ابل رہا ہے۔" صبا نے فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ "کیوں بھئی یہ جمعدار کہاں مرگیا؟" انہوں نے پوچھا۔ "پتہ نہیں۔" صبا نے کندھے اچکائے اچانک دروازے پر ایک تیز قسم کی مانوس سی دستک ہوئی۔ احسان صاحب نے لپک کر دروازہ کھولا۔ سامنے جمعدار کھڑا تھا۔ "سلام جناب" اس نے سلام جھاڑا۔ "وعلیکم! بھئی بچو! دیکھو تو سہی ہمارے گھر کون آیا ہے؟ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرو۔ کیوں بھئی کچھ یاد ہے جناب! کتنے دن پہلے تشریف لائے تھے آپ؟" احسان صاحب نے چبا چبا کر کہا۔ "صاحب میری بیوی فوت ہو گئی۔" جمعدار نے گڑبڑا کر کہا۔ "ہوں اور پچھلے مہینے کس کی بیوی فوت ہوئی تھی؟" وہ چیخ کر بولے "مجھے کیا معلوم؟" جمعدار ڈھٹائی سے بولا۔ "اور اس سے پچھلے مہینے کون مرا تھا؟" احسان صاحب چلّائے۔ "یاد نہیں" جمعدار نے کندھے اُچکائے۔ "ارے بھئی یہاں کیا کسوٹی کھیلی جارہی ہے؟ کچرا اُٹھانے دیجئے ناں اسے۔" بیگم احسان پیچھے سے نمودار ہوئیں۔ "بیگم صاحب تنخواہ"

جمعدار نے ان کی طرف رخ کرلیا۔ "اچھا تو آج تنخواہ لینی تھی، اس لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر چلے آئے جناب" احسان صاحب بڑبڑاتے ہوئے اندر چل دیئے۔ جمعدار نے کچرا ٹرالی میں ڈالا، تنخواہ وصول کی اور چل پڑا۔ بیگم احسان نے دروازہ بند کرلیا۔ جمعدار گلی کے کونے پر رکا، ادھر ادھر اور پھرتی سے سارا کوڑا کچرا گلی میں الٹ دیا۔ پھر خالی ٹرالی لے کر آگے بڑھ گیا۔
ہُما بیٹی! آج گھر کی صفائی تو کر ڈالو، بڑا گندا ہورہا ہے۔ بیگم احسان نے کہا۔ "اوہو امی! اسکول سے تھکی ہاری آئی ہوں۔ آپ کو کیا پتہ ٹیچنگ کتنا مشکل کام ہے؟" ہما نے اِترا کر کہا۔ دراصل انٹر میں تین دفعہ فیل ہونے کے بعد اس نے تعلیم ختم کردی تھی اور وقت گزارنے کے لئے گلی کے کونے پر قائم پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرلی۔ یہ اسکول ایک خاتون نے اپنے گھر کے دو کمروں میں کھولا تھا جہاں محلے کی تمام فیل شدہ اور نالائق لڑکیاں بطور ٹیچر کام کررہی تھیں کیونکہ وہ کم تنخواہ لیتی تھیں۔ جب سے ہُما نے نوکری شروع کی تھی، گھر کے کاموں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ یہی حال صبا کا تھا۔ اس نے بیوٹیشین کا کورس شروع کردیا تھا۔ اب اس کا بیش تر وقت بیوٹی پارلر یا آئینہ کے سامنے گزرتا تھا اور میک اپ کرکے جھاڑو لگانا اسے بالکل پسند

نہیں تھا یہی کچھ حال بھائیوں کا بھی تھا۔ گھر کے معاملات سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ ذیشان کچھ خُفیہ طاقتوں کی مدد سے ایم اے کرچکا تھا مگر اس کا خواب باہر جاکر ملازمت کرنا تھا لہٰذا جب تک احسان صاحب اس کے باہر جانے کا بندوبست نہ کردیتے وہ گھر سے ہلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ گھر میں فلمیں اور کرکٹ میچ دیکھ کر وقت گزار رہا تھا۔

"بیگم یہ دیکھو!" احسان صاحب نے انہیں متوجہ کیا۔ "کیا ہے؟" انہوں نے جُھنجلا کر کہا۔ "بجلی کا بل۔ دو ماہ سے ہمارا بل جمع نہیں ہوسکا۔ اس ماہ ضرور ہونا چاہئے ورنہ بجلی کٹ جائے گی۔" انہوں نے کہا "تو میں کیا منع کرتی ہوں بل جمع کرانے سے؟ کرادیجئے گا۔" بیگم احسان نے چڑ کر کہا۔

"اللہ بخشے میرے والد مرحوم جب تک اس گھر میں تھے' ہر بل کی ادائیگی وقت پر ہوجاتی تھی۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا مگر اب تو ہر کام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ خیر! تم ذیشان سے کہنا وہ بل ضرور جمع کرادے" احسان صاحب بولے۔ "اچھا بھئی کہہ دوں گی۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

آج کل ان کے گھر میں بڑا جوش پایا جاتا تھا کیونکہ ورلڈ کپ شروع ہوچکا تھا سارا گھر کرکٹ

انمول موتی

☆ جس چیز کا علم نہیں اسے مت کہو۔
☆ علم سے انسان کی وحشت دور ہوتی ہے۔
☆ اعتماد محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔
☆ انسان کی بہترین فضیلت علم ہے۔

مرسلہ : پرنس افضل شاہین' بہاولنگر

کا رسیا تھا۔ سارا سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزار دیا جاتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ وہ سب بڑے اہتمام سے ٹی وی کے سامنے بیٹھے مگر ٹی وی نہ چلا۔ معلوم ہوا لائٹ چلی گئی ہے۔ تھوڑی دیر تو صبر کیا پھر شکایتی مرکز میں فون کیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ عدم ادائیگی کی وجہ سے ان کے گھر کی بجلی کاٹ دی گئی ہے۔ ذیشان نے جب یہ خبر سنائی تو احسان صاحب چلّا اُٹھے "تم نے بل جمع نہیں کرایا تھا؟" "میں بھول گیا تھا۔ آخری دن یاد آیا مگر اس روز مجھے اپنا ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے میں نے عمران سے کہا تھا کہ بل جمع کرادینا۔ مگر یہ نکّما! مجال ہے جو کوئی کام کردے" ذیشان نے اسے گُھورا "لو بھئی! حد کردی تم نے' اتنی اہم ذمّہ داری اسکول کے بچے کو سونپ دی" بیگم احسان بھنّائیں۔ "وہ اسکول کا بچّہ! آپ کیا سمجھتی ہیں؟ جتنے دن یہ چھٹیاں کرتا ہے' ان دنوں میں اس کی عمر نہیں بڑھتی!" ذیشان تلملایا۔ "بھئی تم بڑے ہو۔ یہ ذمّہ داری تمہاری

تھی۔" احسان صاحب نے کہا۔ "کیوں بھئی میں کیا بجلی سے چلتا ہوں؟ ساری بجلی میں نے ہی استعمال کی تھی کیا؟" ذیشان غصّے سے بولا۔

"ارے بھئی آپ ہی جمع کرادیتے بل' آپ نے بھی تو کاہلی کی" بیگم احسان ان پر برس پڑیں۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے بچّے اس قدر نکمّے ہیں' کسی کام کے نہیں" احسان صاحب بڑبڑائے۔

"اچھا اب تو جا کر بل جمع کرائیے تاکہ بجلی بحال ہو سکے میچ نکلا جارہا ہے اور پھر رات کو بڑی اچھی فلم بھی آئے گی۔" ہُما نے بے چینی سے کہا۔

"اتنی جلدی بحال نہیں ہوگی بجلی' ایسے فرض شناس نہیں محکمے والے پھر انہیں تو تنگ کرنے کا موقع ملنا چاہیئے دیکھنا اب کتنا ستائیں گے' جُرمانہ الگ بھرنا ہوگا۔ ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے' کل ہی کچھ ہو سکے گا۔ اس کے بعد بھی معلوم نہیں کتنے دن لگائیں گے یہ بجلی والے۔ احسان صاحب بولتے چلے گئے۔ "گویا آج کی رات اندھیرے میں گزارنی ہوگی" صبا نے کہا۔ "ہاں دیکھو! کب تک یہ اندھیرا ہمارا مقدر رہتا ہے؟" بیگم احسان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ انہیں رہ رہ کر بجلی والوں پر غصہ آرہا تھا مگر وہ یہ بھول چکی تھیں کہ یہ اندھیرا ان کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہے!!

طاقت، توانائی اور صحت

احمد ©

مُربّہ جات کی بدولت

احمد کے مُربّہ جات تازہ اور معیاری پھلوں سے طبّی اصولوں کے عین مطابق تیار کئے جاتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ استعمال طاقت اور توانائی پیدا کر کے آپ کو چُست اور صحت مند رکھتا ہے۔

مقابلہ معلوماتِ عامہ

صحابہ کرامؓ

سلسلہ نمبر ۲

صحابہ کرامؓ کی زندگیاں آنحضورؐ کی فیضانِ تربیت کا ثمر ہیں۔ یہ وہ مُقدّس گروہ ہے جس کے بارے میں پیارے نبی کریمؐ کا فرمان ہے : "میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے۔"

صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں کا مطالعہ اور ان کے بارے میں جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ آنکھ مچولی اس ماہ سے صحابہ کرامؓ کے بارے میں ایک معلوماتی مقابلے کا سلسلہ شروع کررہا ہے۔ اُمید ہے آپ اس مقابلے میں ذوق و شوق سے حصّہ لیں گے!

اس سلسلے کا پہلا مقابلہ حاضرِ خدمت ہے!!

جوابات ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۵ مئی ہے!

۱۔ غزوۂ بدر کے پہلے شہید کا نام بتایئے؟

۲۔ پہلی مُسلمان خاتون کا نام بتایئے؟

۳۔ بچّوں میں سب سے پہلے اسلام کس نے قبول کیا؟

۴۔ پہلی انصاری خاتون مُسلمان کا نام بتایئے؟

۵۔ پہلے مؤذّن کا نام بتایئے؟

۶۔ مُسلمانوں کی طرف سے پہلا تیر کس صحابی نے کُفّار کی طرف پھینکا تھا؟

۷۔ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے کن صحابی کی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھائی تھی؟

۸۔ احادیث کا پہلا مجموعہ "الصادقہ" کس صحابی نے مرتّب کیا تھا؟

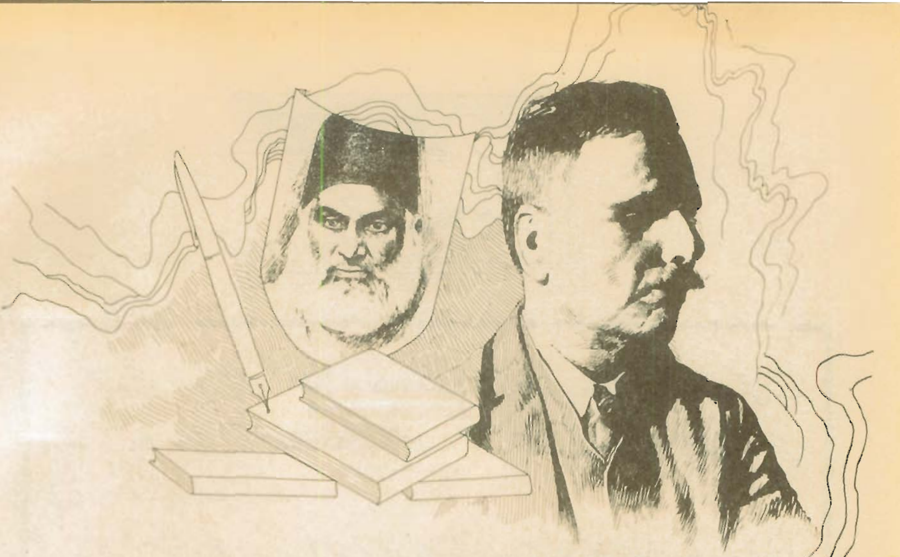

تاریخ ساز دن

محمد انعام

دو ہزار سال پہلے کی بات ہے، ہندوستان پر ایک راجا حکومت کرتا تھا جس کا نام چندر گپت تھا اس کے وزیر اعظم کا نام تو پنڈت چانکیہ تھا مگر عام طور پر لوگ اسے کوٹلیا کہتے تھے کوٹلیا کے معنی ہیں "مکّار عیّار" اس نے کتاب لکھی اور اس کا نام ارتھ شاستر رکھا اس میں اس نے حکومت اور سیاست کے اُصول بیان کئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ دوسروں سے دوستی کرتے وقت اپنی غرض پیش نظر رکھی جائے اور مکّارانہ سیاست کا دامن نہ چھوڑا جائے ہندوؤں نے ہمیشہ پنڈت چانکیہ کے اس اصول پر عمل کیا اور جب بھی کسی سے دوستی کی اپنی غرض کا دامن ہاتھ سے

نہ چھوڑا جب ہندوستان میں مُسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو ظاہر میں مُسلمانوں کے دوست بن گئے لیکن دل میں ان کی تباہی کے متعلق سوچتے رہے آخر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب مُسلمانوں کی حکومت کمزور ہو گئی تو ہندو ذہنیت پوری طرح کھُل کر سامنے آگئی وہ انگریزوں کے ساتھ مل گئے انہوں نے کوٹلیا کی عیّاری اور مکّاری سے کام لے کر تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمت میں کافی عمل دخل حاصل کرلیا نتیجہ یہ نکلا کہ مُسلمان جو سینکڑوں سال ہندوستان پر حکومت کرتے رہے ذلیل و خوار ہونے لگے لیکن رحمتِ حق جوش میں آئی اس نے سرسیّد احمد خان کو مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دینے کے لئے چُن لیا سرسیّد احمد خان چانکیہ کی ذہنیت والی ہندو قوم کے دلی اِرادوں کو بھانپ گئے انہوں نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں لکھا، "یاد رکھو تمہیں اسلام ہی پر جینا اور مرنا ہے اور اسلام کو قائم رکھ کر ہی ہماری قوم قوم ہے۔ اگر کوئی آسمان کا تارا بن گیا مگر مسلمان نہ رہا تو ہم سے کیا وہ ہماری قوم سے نہ رہا۔" انہوں نے اس حقیقت کو بھی پالیا کہ ہندو اور مُسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں ان کا مذہب الگ الگ، تہذیب الگ الگ یہ قومیں کبھی بھی اتفاق سے مِل جُل کر نہیں رہ سکتیں انہوں نے ایک انگریز افسر سے کہا "اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا، دیکھئے گا۔" اور زندہ رہنے والوں نے دیکھا کہ جب گاندھی تلک مدن، موہن مالوی راجپت رائے، موتی لعل نہرو وغیرہ نے جو سب کے سب تعلیم یافتہ تھے کانگریس کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے بظاہر مُسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر مُسلمانوں کی حالتِ زار پر ترس کھایا اور

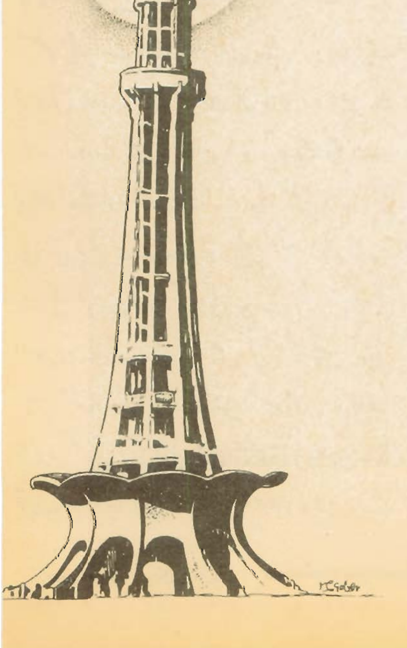

علاّمہ اقبالؒ کے دردمند دل میں یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ جب تک مُسلمانوں کے لئے الگ سرزمین حاصل نہ ہوگی وہ نہ آزادی کا سانس لے سکیں گے نہ ان کا مذہب محفوظ رہے گا انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مُسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا : "میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو مِلا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔" پھر آپ نے قائداعظمؒ کو ۱۹۳۷ء میں ایک خط لکھا ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ اُمیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ آئندہ جو سیلاب آنے کا خطرہ ہے اس میں صرف آپ ہی مُسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرسکیں گے قائداعظمؒ یقینِ محکم سے اُٹھے اور انہوں نے مسلم لیگ کے لئے مسلمانوں کے دلوں کو ایک پُرجوش ولولے سے سرشار کردیا اور برصغیر کے کونے کونے میں پاکستان کا نام گونجنے لگا، ہندو بوکھلا اٹھے اور انگریز سٹپٹانے لگے لیکن قائداعظمؒ کی حق گوئی ثابت قدمی اور یقینِ محکم کے سامنے ہندو کی عیّاری اور انگریز کی سیاست کی دال نہ گلی انہوں نے آپ کی راہ میں کئی رکاوٹیں کھڑی کیں، فسادات کرائے لیکن مُسلمانوں کا قافلہ قائداعظمؒ کی راہ نمائی میں آزادی کی منزل کے قریب ہوتا گیا آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے منٹوپارک (موجودہ اقبال پارک) میں مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا قائداعظمؒ اس جلسے کے صدر تھے۔ شیرِ بنگال مولوی فضل الحق نے ایک قرارداد پیش کی جسے پہلے قرارداد لاہور اور پھر قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا یہی وہ مُبارک تاریخ ہے جب مُسلمانوں نے آزادی کی منزل پر پہنچنے کے لئے تیزی سے سفر شروع کردیا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو انگریزی حکومت نے اعلان کردیا کہ پورے اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کردیئے جائیں گے آخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور مُسلمان اس قابل ہوگئے کہ ایک آزاد ملک میں زندگی کا سانس لے سکیں۔ ۲۳ مارچ ہماری ان کوششوں کی ایک علامت ہے جن کی بدولت ہمیں پاکستان حاصل ہوا کیوں کہ یہی وہ مُبارک تاریخ ہے جب ہم نے پاک سرزمین حاصل کرنے کا عزم کیا تھا۔

اقبال پارک لاہور میں ایک عظیم الشان مینار تعمیر کیا گیا ہے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ کی یاد دلاتا ہے جب یہاں قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی اور مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرنے کا تہیہ کیا تھا ہم اور ہماری آئندہ نسلیں جب بھی اس یادگار مینار کو دیکھیں گی تو ان کے دل میں اس پاک وطن کو مضبوط بنانے اور قائم رکھنے کا ولولہ پیدا ہوگا!!

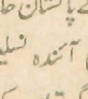

افشاں بشیر

گلاب کا پھول

شاخ پر جب کِھلا گُلاب کا پھول
مجھ کو اچھا لگا گُلاب کا پھول

جب چلی ہولے ہولے بادِ صبا
شاخ پہ جُھوم اُٹھا گُلاب کا پھول

کیسی پیاری مہک گُلاب میں ہے
پھولوں کا بادشاہ گُلاب کا پھول

اس سے حاصل ہوا ہے عرق گُلاب
عطرِ گُل سے بھرا گُلاب کا پھول

اس سے گُل قند بھی بناتے ہیں
نسخۂ کیمیا گُلاب کا پھول

ہے خوشی اور غم میں سب کا شریک
کام آیا سدا گُلاب کا پھول

پوچھا بچّے نے "ماں میں کیسا ہوں؟"
ماں نے ہنس کر کہا "گُلاب کا پھول!"

ہے نصیحت یہی میرے بچّو
مت کبھی توڑنا گُلاب کا پھول

بات سچّی یہی ہے سُن لو سب
شاخ ہی پر بھلا گُلاب کا پھول

الطاف حسین

استنبول
مسجدوں کا شہر

۶۶۵۸ء قبل مسیح میں آبنائے باسفورس کے کنارے یونانیوں نے "بائیزاس" کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام رومی عہد میں بدل کر "بیزنطیم" رکھ دیا گیا۔ مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد جب ۱۱ مئی ۳۳۰ء کو یورپ کے مشرقی حصہ میں نئی رومی سلطنت قائم ہوئی تو یہ شہر اس دور کے رومی شہنشاہ، قسطنطین کے نام سے منسوب ہو کر "قسطنطنیہ" کہلایا اور اس کے بعد اگلے ہزار سال تک اسے دنیا کا اوّلین منصوبہ بند شہر ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ ان دنوں اس کا سرکاری نام "روم الجدید" تھا۔ جبکہ عرب تاریخ میں اسے "مدینتہ الروم" لکھا گیا ہے۔ یہ شہر بھی روم کی طرح سات پہاڑیوں پر بسایا گیا تھا۔ اس کے جنوب میں بحیرہ مرمرا اور شمال میں ۲۱ کلو میٹر طویل آبنائے باسفورس واقع تھی۔ جس سے ۶.۵ کلو میٹر لمبی خلیج زریں شہر کی فصیل تک چلی گئی تھی۔ دوسری سمت میں بحیرہ اسود سے بحیرہ روم تک جگہ جگہ تنگنائیں تھیں جن سے بحری جہازوں کا سلامت گزر جانا ناممکن تھا اور خشکی کے راستے پر یکے بعد دیگرے تین مضبوط اور بلند فصیلیں بنا دی گئی تھیں۔ ان قدرتی اور انسانی تعمیر کردہ رکاوٹوں نے قسطنطنیہ کو دنیا کا ناقابل تسخیر شہر بنادیا تھا۔ یونانیوں نے کئی بار اس شہر پر چڑھائی کی لیکن ہر بار انہیں ناکامی کا بوجھ لئے واپس لوٹنا پڑا۔ یورپ کے وحشی قبائل اور جنگجو ایرانیوں نے بھی متعدد بار طاقتور لشکر کشی کی لیکن ان سے بھی یہ عظیم شہر فتح نہ ہوسکا اور پھر جب دنیا اسلام کے نور سے منوّر ہوئی تو سرور کونینؐ نے ارشاد فرمایا کہ "میری اُمّت کا جو لشکر بھی قیصر کے (اس) شہر کو فتح کرے گا اسے اللہ بخش دے گا" ایک اور موقع پر آپؐ نے بشارت دی کہ "تم قسطنطنیہ ضرور فتح کرلو گے اور وہ فاتح بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے۔"

چنانچہ آپؐ کے ارشاد کے بعد عرب مسلمانوں نے مختلف ادوار میں آٹھ بار قسطنطنیہ پر حملے کئے لیکن اس پر قبضہ نہ کرسکے اور پھر ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو اسلام کے مایہ ناز فرزند اور سلطنت عثمانیہ کے حکمران سلطان محمد دوئم نے انتہائی حیرت انگیز حکمت عملی کے باعث ناقابلِ تسخیر قسطنطنیہ کو فتح کر ڈالا۔ عالم اسلام نے اس بہادر اور ذہین سپہ سالار کو اس عظیم الشان کارنامہ پر "فاتح" کے منفرد اور قابل رشک خطاب سے نوازا۔ متعصب انگریز مورخین تک نے اس بے مثال فتح پر سلطان محمد فاتح دی گریٹ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور اس واقعہ کو تاریخ کا ایک ایمان افروز معجزہ قرار دیا۔ اس عظیم ترین فتح کی کہانی بہت عجیب و غریب ہے۔ ۲۰ اپریل

۱۴۵۳ء کو پر عزم سلطان محمد ۷۰ ہزار فوج اور بھاری توپ خانے کے ساتھ شہر کے سامنے پہنچا۔ جب کئی دن کی گولہ باری کے باوجود فتح کے آثار دکھائی نہ دیئے تو اس نے ایک انتہائی حیران کن فیصلہ کیا۔ جس کے تحت آبنائے باسفورس سے خلیج زریں کے دوسرے سرے کے درمیان ۱۶ کلو میٹر لمبی پتھریلی زمین پر بڑے بڑے لکڑی کے تختے بچھائے گئے اور ان پر چربی کی موٹی تہہ جمادی گئی اور پھر بحری جہاز نما کشتیوں کو ان تختوں پر چڑھا دیا گیا۔ جنہیں رات کے اندھیرے میں ایک آدمی اور بیل کھینچتے ہوئے خلیج کے کنارے کی طرف چل پڑے۔ ادھر رومی فوج نے مغربی ساحل پر روشن مشعلیں تو دیکھ لیں لیکن تاریکی کے باعث یہ نہ سمجھ سکے کہ وہاں کیا "تاریخ ساز کاروائی" ہو رہی ہے؟ جب صبح کا اُجالا پھیلا تو اسلامی بحری بیڑا شہر کے بالائی حصے تک پہنچ چکا تھا۔ رومی فوج نے بحری اور بُری راستوں کے ذریعے خود کو محصور ہوتے دیکھ کر اپنا مشہور حربہ "یونانی آگ" استعمال کیا لیکن وہ مسلمان جانبازوں کے عزائم کو نہ توڑ سکے اور محاصرہ بدستور جاری رہا۔ ۲۹ مئی کی رات سلطان اور اس کی فوج نے عبادت میں گزاری اور فجر کی نماز کے بعد عام حملہ کا آغاز کیا گیا۔ قسطنطین قیصر یازدھم کے مرتے ہی اس کی فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی لشکر خلیج زریں کی فصیل توڑ کر شہر کے اندر داخل ہو گیا اور ناقابل تسخیر ہونے کے دعویداروں کو عبرت ناک شکست دے کر شہر پر اسلامی پرچم لہرا دیا گیا۔ جو گیارہ سو سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا علامتی اعلان تھا اور یوں آنحضرتؐ کا وہ ارشاد پورا ہو کر رہا کہ "جب قیصر ہلاک ہو گا تو پھر کوئی دوسرا قیصر پیدا نہیں ہو گا۔"

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو سلطنت عثمانیہ کا پایہ تخت بنایا اور اس کا نیا نام "اسلام بول" رکھا گیا۔ عثمانی ترکوں نے یہاں ۴۷۱ سال تک نہایت شان اور دبدبے سے حکومت کی۔ ۱۹۲۴ میں مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں اسلام بول کو "استنبول" کا موجودہ نام ملا اور اس کی دارالحکومت کی حیثیت ختم کرتے ہوئے "انقرہ" کو ترکی کا نیا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

قابلِ فخر "استنبول" ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں ۹۲ فیصد لوگ ترک مسلمان ہیں اور بقیہ ۸ فیصد تعداد مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی ہے۔ سرکاری مذہب اسلام اور زبان ترکی ہے جو رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ یہاں رائج شدہ کرنسی "لیرا" کہلاتی ہے۔

فرانس کے مشہور سپہ سالار نپولین بوناپارٹ نے ایک بار کہا تھا کہ "اگر دنیا ایک متحدہ سلطنت

بن جائے تو اس کے لئے قسطنطنیہ (استنبول) سے بڑھ کر کوئی موزوں دارالحکومت نہ ہوگا۔" اس شہر کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جو دو براعظموں ایشیا اور یورپ میں پھیلا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ سیاحوں کی اکثریت اسی شہر سے دنیا کی سیاحت کا آغاز کرتی ہے۔

استنبول کو عثمانی عہد کی بے شمار تاریخی اور قدیم یادگاروں نے دنیا کا ایک دلکش اور زندہ ثقافتی شہر بنادیا ہے۔ دنیائے اسلام کے تمام شہروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ مسجدیں اسی شہر میں ہیں۔ جن کی تعداد ۵۰۰ ہے۔ ان کی وجہ سے استنبول دنیا بھر میں "مسجدوں کا شہر" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۶۱۷ء میں مکمل ہونے والی "جامع سلطان احمد" اپنی زیب و زینت نقاشی اور فن تعمیر کے لحاظ سے شہر کی سب سے خوبصورت ترین مسجد کہلاتی ہے۔ سلطان احمد کا مقبرہ بھی یہیں ہے۔ ان کی والدہ کوسم بیگم، بیٹے عثمان ثانی، بیٹی ماہ پیکر اور سلطان مراد رابع کی قبریں بھی اسی جگہ ہیں۔ "جامع سلیمانیہ" اپنی وسعت کے لحاظ سے استنبول کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس کا رقبہ ۶۰۰۰۰ مربع میٹر ہے۔ جس میں مسجد کے علاوہ چار دینی مدرسے، لنگر خانہ اور مکانات بھی بنائے گئے ہیں۔ اس مسجد کا سنگ بنیاد ۱۵۵۰ء میں رکھا گیا تھا اور ۱۵۵۷ء میں ترکی کے شہرت یافتہ ماہر تعمیرات جناب سنان کے ہاتھوں یہ مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ مسجد کے صحن میں سلیمان اعظم، سلطان سلیمان ثانی، احمد ثانی اور بہت سی سلطانی بیگمات کے مقبرے ہیں۔ قریب ہی "جناب سنان" آسودہ خاک ہیں۔ جنہوں نے انتھک محنت اور پر خلوص محبتوں کے ساتھ ترکوں کی ۳۵۰ سے زائد عظیم یادگاریں تعمیر کی۔ "جامع سلیمانیہ" کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی بالائی منزل سے پورے استنبول کا دلفریب نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ جامع بایزید، جامع سلطان سلیم، جامع شہزادہ محمد، جامع یمنی اور جامعہ نورد عثمانیہ شہر کی دیگر خوبصورت اور اسلامی فن تعمیر کی شاہکار یادگاریں ہیں۔

مقبرہ سنان سے کچھ فاصلے پر محلہ ایوب واقع ہے۔ جہاں میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار ہے۔ آپؓ ۶۷۲ میں قسطنطنیہ (استنبول) پر حملہ کرنے والے پہلے اسلامی لشکر میں شامل تھے۔ دوران جنگ آپؓ کا حالت بیماری میں انتقال ہوگیا اور وصیت کے مطابق آپؓ کو شہر کی فصیل کے قریب سپرد خاک کرانے کے بعد یہاں مزار بنوایا اور "جامع ایوبؓ" کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ جس میں عثمانی سلاطین کی رسم تاج پوشی ادا کی جاتی تھی۔ (جاری ہے)

صبحِ آزادی

عنبر چغتائی

اسلام کے اے شاداب چمن! ایمان کے جلوے سے روشن
اے ارضِ مقدّس پاک وطن
تجھ پر ہے نچھاور تن، من، دھن
ہو تجھ کو مبارک آزادی

وہ دورِ غلامی دُور ہوا، دل مِلّت کا مسرور ہوا
اے ارضِ مقدّس، پاک وطن!
تجھ پر ہے نچھاور تن، من دھن
ہو تجھ کو مبارک آزادی!!!

زرّین عہد یہ آیا ہے، ایمان و اخوّت لایا ہے

اے ارضِ مقدّس، پاک وطن!
تجھ پر ہے نچھاور تن، من دھن
ہو تجھ کو مبارک آزادی!!!
دنیا کو بدل دینا ہے ہمیں! پیغامِ عمل دینا ہے ہمیں!
اے ارض مقدّس، پاک وطن!
تجھ پر ہے نچھاور تن، من، دھن!
ہو تجھ کو مبارک آزادی!!!
افلاس نہ رہنے پائے گا! یہ جہل بھی اب مِٹ جائے گا
اے ارضِ مقدّس پاک وطن!
تجھ پر ہے نچھاور تن، من دھن

بچوں کے مقبول مصنف

محمد عادل منہاج

کیا کہتے ہیں؟

◎ محمد عمر احمد خان ◎ سیما صدیقی

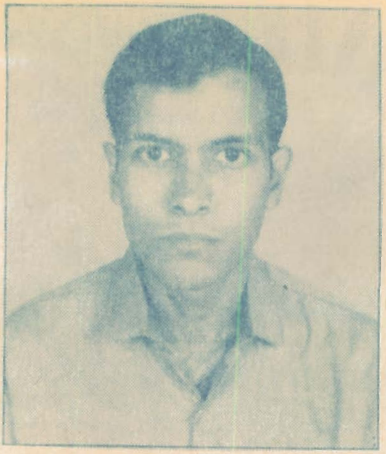

نام : محمد عادل منہاج
مقام پیدائش : لاہور
تاریخ پیدائش : 29 مئی 1970ء
تعلیم : بی ایس سی' بی ای (الیکٹریکل)
مکاتب : عطا ماڈل اسکول لاہور' ٹاؤن کمیٹی اسکول نیو کراچی
دہلی کالج کراچی' آدم جی کالج کراچی' این ای ڈی یونیورسٹی کراچی'
ایوارڈ : دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۹۳ء میں بچوں کے بہترین ادیب کا ایوارڈ۔
کہانیوں کی تعداد : تقریباً" سو' تین ناول
کہاں کہاں لکھ رہے ہیں : آنکھ مچولی' پھول' ساتھی
پسندیدہ موضوع : سائنس

آنکھ مچولی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی تحریروں کو ترجیحی بنیادوں پر شائع کر کے ان میں چھپی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارا یوں تو بے شمار نوجوان ادیب لکھ رہے ہیں اور آنکھ مچولی میں...... تقریباً" سب ہی خوب لکھ رہے ہیں لیکن ان میں ایک نام ایسا ہے۔ جو بچوں میں بے حد مقبول ہے۔ اور وہ نام ہے محمد عادل منہاج کا۔

عادل منہاج زیادہ تر سائنس فکشن پر لکھتے ہیں ان کی تحریریں نت نئے خیالات' چونکا دینے والے موضوعات اور دلچسپی جیسے لوازمات سے پُر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ہر خاص و عام میں مقبول ہیں۔

گزشتہ کئی ماہ سے قارئینِ آنکھ مچولی کی جانب سے عادل کے انٹرویو کی فرمائش کی جا رہی

تھی لیکن کام کی زیادتی کے باعث عادل کے ساتھ ملاقات کا وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ پھر وقت ملا تو پتا چلا کہ عادل کے والد صاحب علیل ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کے گُردے میں پتھری تھی جس کا آپریشن ہونا تھا۔ اب ہم انتظار کرنے لگے کہ عادل کے والد صاحب کا آپریشن بخیروخوبی انجام کو پہنچ جائے تو ہم ان کا انٹرویو کریں۔ پہلے ہم نے یہ طے کیا تھا کہ عادل کا انٹرویو فروری کے شمارے میں شامل کریں گے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور ہم دعاگو تھے کہ عادل کے ابو کا آپریشن کامیابی کے ساتھ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور ڈاکٹروں کی کاوشوں سے عادل کے ابو کے گُردے سے پتھری نکال دی گئی اور اب وہ صحت یاب ہو رہے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مکمل طور پر صحت یاب فرمائیں آمین! آپ لوگ بھی عادل کے ابو کو اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیں۔

عادل سے مل بیٹھ کر بات چیت کا چوں کہ موقع نہ تھا اس لئے ہم نے سیما صدیقی باجی کے ساتھ مل کر ایک سوالنامہ ترتیب دیا اور عادل کو بھجوادیا۔ عادل نے جو جوابات تحریر کئے وہ قارئین کی خدمت میں پیش کررہے ہیں :

سوال : عادل! آپ کے خیال میں کیا ہر شخص مصنف بن سکتا ہے یا یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے؟

عادل : میرے خیال میں مصنف ہی نہیں کوئی بھی شعبہ زندگی ہو، ہر شخص اسے اختیار نہیں کرسکتا ہر شخص میں دوسرے سے مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں اور وہ انہی کی بنیاد پر کسی بھی شعبے یا دلچسپی کو اختیار کرتا ہے۔

سوال : آپ لکھنے کے لئے عموماً" سائنس فکشن کا ہی انتخاب کیوں کرتے ہیں؟

عادل : ابتدا میں تو ہر موضوع پر ہی لکھا پھر ایک بار سائنس فکشن تحریر "وائرس کا پیغام" لکھی جس کے بعد چند لوگوں نے مجھے صرف سائنس ہی پر لکھنے کا مشورہ دیا۔ میں نے سوچا کہ مختلف موضوعات کے بجائے صرف ایک موضوع پر لکھ کر تجربہ کرتا ہوں اور یہ تجربہ اب تک جاری ہے۔

سوال : آپ کی کچھ تحریروں سے متعلق لوگوں کی رائے ہوتی ہے کہ ان کا خیال عموماً" ماخوذ ہوتا ہے لیکن آپ ان کا حوالہ نہیں دیتے کیوں؟

عادل : میں نے جتنی ماخوذ یا ترجمہ کہانیاں لکھیں ان کا حوالہ ضرور دیا مثلاً "انوکھا تجربہ" "چوہے کی شرارت" وغیرہ مگر بہت سی کہانیاں مثلاً "مجرم کا ہاتھ" "رات کا ہنگامہ" وغیرہ کا خیال سو فی صد میرا تھا۔ لیکن ان کے لکھنے کے

اسٹائل کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے انہیں ماخوذ سمجھ لیا تو بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔

سوال : عادل آپ یہ بتایئے کہ آپ کو بڑوں کے لئے لکھنا زیادہ اچھا لگتا ہے یا بچّوں کے لئے؟

عادل : بڑے جس قسم کا ادب پڑھتے ہیں وہ میں نہیں لکھ سکتا اور اس لئے کبھی بھی بڑوں کے لئے لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

سوال : آج کل وہ کون سا موضوع ہے جس پر آپ ہر وقت لکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں؟

عادل : سوال نمبر دو کے جواب سے سمجھ لیجئے۔

سوال : آپ کے مطالعے میں کون کون سے ادیب رہتے ہیں؟

عادل : اپنی تعلیمی مصروفیات کے باعث میرا مطالعہ بہت کم ہو پاتا ہے۔ آج کل تو بس بچّوں کے رسالے ہی پڑھ رہا ہوں۔

سوال : آپ اپنی کہانیوں میں جاسوسی' تخیّلاتی عنصر بہت ہوتا ہے۔ تو کہیں آپ اس فکشن کے ذریعے بچّوں کو حقیقت سے دور تو نہیں لے جا رہے ہیں؟

عادل : جاسوسی یا فکشن نہیں بلکہ کم علمی انسان کو حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔

سوال : آپ کے خیال میں کہانی میں مقصدیت کس حد تک ہونی چاہئے؟

عادل : ہونی تو پوری حد تک چاہئے بس پڑھنے والا یہ محسوس نہ کرے کہ کوئی چیز اس پر زبردستی ٹھونسی جا رہی ہے۔

سوال : کچھ ادیب اصلاحی تحریریں لکھتے ہیں اور کچھ تفریحی۔ ان دونوں میں سے آپ کی پہلی ترجیح کیا ہوگی؟

عادل : تفریحی اصلاح

سوال : عادل! آپ کے ناول اشتیاق پبلی کیشنز سے شائع ہوئے خیال تھا کہ آپ اور بھی ناول لکھیں گے لیکن! ایسا نہیں ہوا کیوں؟

عادل : میں نے ایک ناول ہمدرد والوں کو دیا تھا جو اشاعت کے لئے منتخب ہونے کے باوجود تین سال سے درمیان میں لٹک رہا ہے اسی طرح ایک آنکھ مچولی میں دیا تھا وہ بھی منتخب ہونے کے بعد لائن میں لگا ہوا ہے بس اتنا طویل طویل انتظار مجھ سے نہیں ہوتا اس لئے دو ناولوں کے بعد ہمت ہی نہیں ہوئی۔

سوال : ہر ادیب لکھنے لکھانے میں کسی نہ کسی بڑے ادیب سے متاثر ہوتا ہے تو آپ بتایئے کہ آپ لکھنے لکھانے میں کس سے مُتاثر ہیں؟

عادل : جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ گزشتہ چار پانچ سال سے میں پڑھائی میں بہت مصروف رہا اور مطالعہ بہت کم رہا۔ جو تھوڑا بہت پڑھا اس میں کبھی کسی کی تحریر پسند آجاتی تو کبھی کسی اور کی

اس لئے ظاہر ہے کس سے متاثر ہوتا۔

سوال : آپ کے جاسوسی ناولوں کا انداز اشتیاق احمد سے خاصا ملتا جلتا ہے اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

عادل : شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسکول کے زمانے میں، میں نے اشتیاق احمد کو بہت پڑھا لہٰذا جب پہلے دو ناول لکھے تو اسی انداز میں لکھے گئے۔ تاہم جب ماہنامہ ساتھی میں چھپنے والے ناول پر یہ اعتراض ہوا تو میں نے چند اقساط کے بعد ہی اس کا انداز بالکل بدل دیا تھا۔ جسے سب نے محسوس بھی کیا۔

سوال : ہر ادیب کو اپنی کچھ تحریریں بہت پسند ہوتی ہیں تو آپ کو اپنی تحریروں میں سے کون سی زیادہ پسند ہے؟

عادل : پسند بدلتی رہتی ہے (بھلا اپنی تخلیق کو کون بُرا کہے گا!)

سوال : عادل، آپ نے الیکٹریکل میں بی ای کیا ہے اس میں تو بے حد توجہ کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ پڑھائی کے لئے اور کہانیاں لکھنے کے لئے کس طرح وقت نکالتے تھے؟

عادل : دراصل میری پہلی ترجیح ہمیشہ تعلیم رہی ہے باقی چیزیں اس کے بعد کی ہیں لکھنے لکھانے کا کام بھی اس وقت کرتا ہوں جب فارغ ہوتا ہوں یہی وجہ ہے کہ امتحانات کے دوران میں بالکل نہیں لکھتا۔

سوال : عادل آپ آج کل کے بچوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

عادل : آج کل کے بچے کچھ زیادہ ہی عقل مند ہیں انہیں پیغام دینے کا اتنا فائدہ نہیں بس اتنی گزارش ہے کہ اپنی عقل کو صحیح جگہ پر استعمال کریں!!

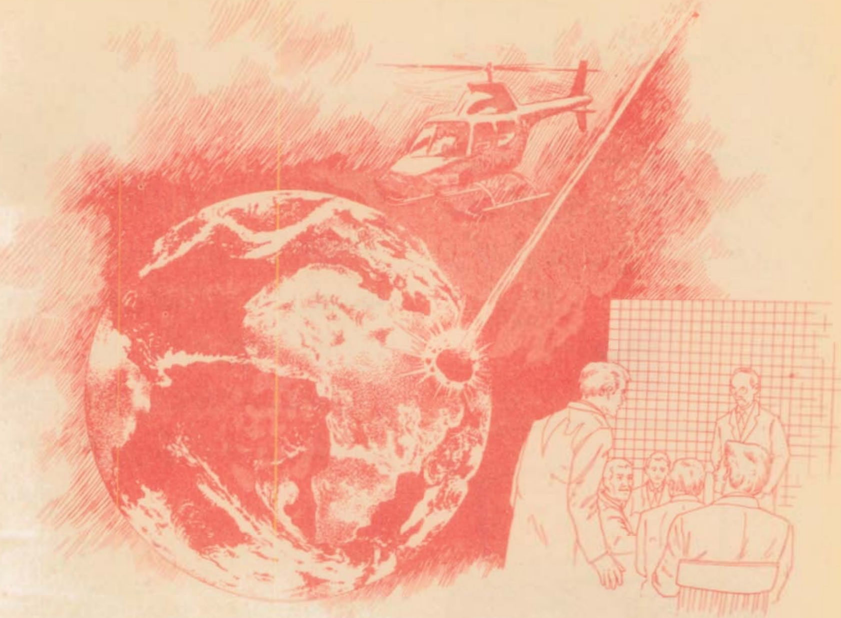

زندہ زمین

محمد عادل منہاج

وہ جیپ آہستہ روی سے کچی سڑک پر لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ ایک غیر آباد میدانی علاقہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مٹی کے ٹیلے نظر آرہے تھے۔ جا بجا گڑھے تھے جن میں سے بعض خاصے گہرے تھے۔ کچھ فاصلے پر دائیں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ یہ پہاڑیاں زیادہ تر مٹی اور پتھروں پر مشتمل تھیں۔ سبزے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ جیپ کا رُخ بھی پہاڑیوں ہی کی طرف تھا۔ کچھ دیر مزید لڑکھڑانے اور ڈگمگانے کے بعد جیپ ایک پہاڑی کے دامن سے کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ پھر جیپ سے چند افراد نیچے اُترے۔ یہ تعداد میں پانچ تھے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید داڑھی بھی تھی مگر جسمانی طور پر چاق و چوبند تھا۔ ایک غالباً" ڈرائیور تھا وہ جیپ کے دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ باقی تین درمیانی عمر کے تھے۔

ایک کے ہاتھ میں کیمرہ تھا اور ایک کے پاس بیگ تھا۔

"یہی وہ جگہ ہے جہاں پرسوں رات شہاب ثاقب کے ٹکڑے گرے تھے۔" ایک شخص بولا'

"ہاں یہاں کافی تعداد میں پتھر کے ٹکڑے اِدھر اُدھر نظر تو آرہے ہیں۔ شہاب ثاقب زمین کی فضا میں داخل ہونے کے بعد کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا اور اس کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے زمین سے ٹکرائے تھے۔ ہمیں اس کے بڑے ٹکڑے تلاش کرنے چاہئیں۔ آؤ آگے چلتے ہیں۔" بوڑھا اور چاروں افراد آگے بڑھے۔ ڈرائیور البتہ وہیں کھڑا رہا۔

"یہ تو شکر ہے کہ شہاب ثاقب اس غیر آباد جگہ گرا۔ اگر آبادی پر گرا ہوتا تو اچھی خاصی تباہی مچادیتا۔" لمبے قد والا شخص بولا۔

"ہاں جب یہ خبر شائع ہوئی تھی تو پورے ملک میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔" دوسرا بولا۔

"قدرتی بات ہے۔ مگر شہاب ثاقب زمین سے ٹکرانے سے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو بالکل راکھ ہوجاتے ہیں اس لئے اتنا نقصان نہیں پہنچاتے۔" بوڑھا بولا۔

"ارے وہ دیکھئے پروفیسر! اس کھائی میں۔" کیمرے والے شخص نے اشارہ کیا۔ سب نے ادھر دیکھا۔ یہ خاصی گہری کھائی تھی اور اس کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا کالا پتھر پڑا تھا۔

"اوہ! یہ تو شہاب ثاقب کا بہت بڑا ٹکڑا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو ندیم۔ ہمیں کھائی میں اُتر کر اس کا جائزہ لینا چاہئے۔" بوڑھے پروفیسر نے کہا۔

"اس طرف سے اُترنے کا راستہ ہے۔" کیمرے والا بولا۔

"اُف!!" اسی وقت ندیم کے منہ سے نکلا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔ اچانک ہی اس کے جسم سے پسینہ پھُوٹ نکلا اور پھر اس کے منہ سے عجیب سی آواز میں نکلا' "خبردار! تم اس پتھر کی طرف بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

سب نے حیران ہوکر اس کا جملہ سنا۔

"یہ.....یہ تم کیا کہہ رہے ہو ندیم؟ اور یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟" پروفیسر نے حیرانگی سے کہا۔

"میں ندیم نہیں بلکہ زمین بول رہی ہوں۔" ندیم نے اسی طرح عجیب سی آواز میں کہا۔

"زمین بول رہی ہوں۔ کیا مطلب!!" لمبے قد والے کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

"ہاں اس علاقے کی زمین کو زندگی مل گئی ہے۔ میں نے اس شخص یعنی ندیم کے دماغ پر قبضہ کرلیا ہے اور اس کی زبان سے درحقیقت میں یعنی زمین بول رہی ہوں۔" ندیم نے کہا۔

"یہ تم کیا ڈرامہ کر رہے ہو۔ ختم کرو یہ مذاق۔" کیمرے والے کو غصہ آگیا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔" ندیم تیز لہجے میں بولا۔ "میں تم لوگوں کو وارننگ دیتی ہوں کہ اس ایک مربع میل کے علاقے سے دور نکل جاؤ اور یہاں سے شہاب ثاقب کا کوئی ٹکڑا اٹھانے کی کوشش مت کرو۔"

"تمہیں مزہ چکھانا ہی ہوگا۔" کیمرے والا غصے سے ندیم کی طرف بڑھا۔

"خبردار! رک جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔" ندیم دھاڑا مگر کیمرے والے کے قدم نہ رکے۔ اسی وقت ایک زور دار گڑگڑاہٹ گونجی اور جہاں کیمرے والے کے قدم تھے۔ وہاں سے زمین پھٹ گئی۔ ایک گہری دراڑ نمودار ہوئی۔ کیمرے والا دراڑ میں جاگرا۔ فوراً ہی دراڑ بند ہوگئی اور کیمرے والا سینے تک زمین میں دھنس گیا۔

"مم...... مجھے بچاؤ پروفیسر۔" کیمرے والا بھیانک آواز میں چلایا۔

پروفیسر اور لمبے قد والے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ...... یہ ہم نے کیا دیکھا ہے پروفیسر؟ کیا یہ کوئی خواب ہے۔"

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے نکالو۔" کیمرے والا چلا رہا تھا۔

"کیوں اب آیا یقین یا نہیں۔ یہ میری پہلی وارننگ تھی۔ لو میں اس بے وقوف شخص کو آزاد کر رہی ہوں۔ فوراً یہاں سے ایک میل دور چلے جاؤ ورنہ تم سب کو زندہ دفن کردوں گی۔" ندیم نے کہا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی پھر گڑگڑاہٹ گونجی اور زمین پھٹ گئی۔ کیمرے والا زور سے اچھلا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے اچھال پھینکا ہو۔ دراڑ فوراً بند ہوگئی اور کیمرے والا نیچے آگرا۔ پھر فوراً ہی وہ اٹھا اور چیختا چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ پروفیسر اور لمبے قد والے نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اسی وقت ندیم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے حیران ہو کر ان سب کو بھاگتے دیکھا پھر وہ چلایا' "کیا ہوا؟ آپ لوگ کہاں بھاگے جارہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ان کے پیچھے دوڑا۔ جیپ کے ڈرائیور نے حیران ہو کر یہ منظر دیکھا۔

"خ.... خیر تو ہے؟" اس کے منہ سے نکلا۔ مگر اس کی بات کا جواب دیے بغیر سب جیپ میں بیٹھ گئے۔

"فوراً واپس چلو۔" پروفیسر بولے۔ "ہوا کیا ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں نے کہا ہے فوراً واپس چلو۔" پروفیسر غصے میں بولے اور ڈرائیور نے پریشان ہو کر فوراً جیپ اسٹارٹ کردی۔ اسی وقت ندیم چلایا۔

"آپ لوگ مجھے چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں؟"

ایک دم ہی ندیم اوپر اچھلا اور جیپ کے اندر آگرا۔ جیپ بغیر چھت کے تھی۔ کیمرے والے نے بمشکل اسے سنبھالا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

پروفیسر ادریس کا تعلق خلائی تحقیق کے ادارے سے تھا۔ چند دن ادارے کی طرف سے یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک شہاب ثاقب کا رخ زمین کی طرف ہے اور امکان ہے کہ وہ ان کے ملک پر گرے گا۔ یہ خبر پڑھ کر پورے ملک میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ اگرچہ شہاب ثاقب تو وقتاً فوقتاً زمین پر گرتے ہی رہتے ہیں، مگر جب وہ زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ کی وجہ سے جل جاتے ہیں اور راکھ کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں اس لئے کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر اس شہاب ثاقب کا سائز بہت بڑا تھا اور خطرہ تھا کہ یہ جلنے کے بعد بھی بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں گرے گا۔ مگر پھر خطرہ ٹل گیا اور شہاب ثاقب کے ٹکڑے ملک کے شمالی صوبے کے ایک غیر آباد علاقے میں گرے۔ پروفیسر ادریس اور ان کے ساتھی آج انہی ٹکڑوں کا جائزہ لینے یہاں آئے تھے کہ یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

قریبی شہر پہنچتے ہی انہوں نے بے ہوش ندیم کو ہسپتال میں داخل کیا اور ٹیلیفون پر ادارے کے چیئرمین کو ساری صورتحال بتائی۔ اس کی حیرت کا کیا پوچھنا۔ اس نے کہا کہ وہ پہلی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہا ہے۔

شام کا وقت تھا۔ بہت سے لوگ اس شہر کے ایک ریسٹ ہاؤس میں جمع تھے۔ ان میں سائنس دان، پریس رپورٹر، علاقے کا کمشنر اور دوسرے ذمہ دار لوگ تھے۔

"آپ کا کیا خیال ہے پروفیسر۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بے جان زمین زندہ ہوجائے۔" چیئرمین نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ اس شہاب ثاقب کے گرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"کیا مطلب!" کمشنر کے منہ سے نکلا۔

"جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت سے شہاب ثاقب کاربن، ہائیڈروجن اور دوسرے مرکبات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زندگی کے لئے سب سے ضروری چیز کاربن ہے۔ جب کاربن کے ایٹم ایک خاص ترتیب سے جڑ جاتے ہیں تو ایک مرکب امائنو ایسڈ بناتے ہیں جو زندگی کی بُنیاد ہے۔ میرے خیال میں شہاب ثاقب کے ٹکرانے سے زمین میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور کاربن کے ایٹم اس خاص ترتیب میں آگئے۔ جس سے زمین میں زندگی نمودار ہوئی۔"

"عجیب الجھی ہوئی سی بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ زندگی صرف ایک خاص حصے ہی میں کیوں پیدا ہوئی پوری زمین میں کیوں نہ ہوئی۔" ایک اخباری رپورٹر بولا۔

"ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی جہاں شہاب ثاقب ٹکرایا ہے۔ وہاں کی زمین زندہ ہو گئی ہو اور یہ زندگی آہستہ آہستہ پھیلتی جائے جس طرح چھوٹا سا پودا بڑھ کر بھرپور درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس چھوٹے سے علاقے کی زندگی پوری زمین میں پھیل جائے مگر حتمی بات تو اس علاقے کی مٹی کا تجزیہ کر کے ہی بتائی جا سکتی ہے۔" پروفیسر بولے۔

"اوہ! مگر وہاں سے مٹی کس طرح حاصل کی جائے۔ وہاں تو جو بھی جائے گا۔ زمین اسے اندر دھنسا دے گی۔" لمبے قد والا گھبرا کر بولا۔

"ہاں مگر ہمیں ہر حالت میں وہاں سے مٹی کا نمونہ حاصل کرنا ہے ورنہ آہستہ آہستہ پوری زمین زندہ ہو گئی تو کیا ہو گا؟" پروفیسر دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

"اوہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔" کیمرے والا بولا۔

"وہ کیا؟" کئی آوازیں بیک وقت ابھریں۔

"ہیلی کاپٹر..... ہمیں ہیلی کاپٹر استعمال کرنا چاہئے۔" اس نے جواب دیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

ہیلی کاپٹر کے پر تیزی سے گھوم رہے تھے اور وہ ہواؤں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"بس روک لو۔" پروفیسر ادریس چلائے۔ "یہاں سے وہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"ہمیں تھوڑا سا آگے بڑھنا چاہئے اور مٹی کا نمونہ ذرا آگے سے لینا چاہئے۔" لمبے قد والا بولا۔

"ہاں مگر زیادہ آگے جانا بھی خطرناک ہو گا۔ نہ جانے یہ زمین کیا کر بیٹھے۔ خیر ذرا سا آگے چلو۔"

ہیلی کاپٹر کچھ فاصلہ طے کر کے ہوا میں معلق ہو گیا۔ پھر ایک شخص دروازے سے نکلتا نظر آیا۔ اس کی کمر سے ایک باریک مگر مضبوط تار بندھا تھا۔ لمبے قد والا آہستہ آہستہ چرخی گھما رہا تھا اور لٹکا ہوا شخص نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ندیم تھا۔ کل رات اسے ہوش آ گیا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد جب ساری بات اسے بتائی گئی تو اسے قطعاً یقین نہ آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بالکل یاد نہیں کہ زمین نے اس کے دماغ پر قبضہ جما کر کیا کچھ کہلوایا تھا۔

"بس اتنا کافی ہے۔" پروفیسر بولے اور لمبے قد والے نے چرخی گھمانا بند کر دی۔ ندیم زمین سے ذرا سا اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی کھرپی اور دوسرے میں پلاسٹک کی تھیلی تھی۔ اس نے تیزی سے کھرپی زمین پر چلائی تاکہ

ذرا سی مٹی کھود کر تھیلی میں ڈال لے مگر کھرپی جونہی زمین سے لگی پھر باہر نہ نکل سکی۔ ندیم نے پوری طاقت لگا کر اسے کھینچنا چاہا مگر زمین نے تو گویا اسے جکڑ لیا تھا۔

"پروفیسر۔ کھرپی زمین میں پھنس گئی ہے۔ نکل نہیں رہی۔" وہ منہ اوپر کر کے چلایا۔

"اوہ! تو گویا یہ ہمیں مٹی نکالنے نہیں دے گی۔" ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

اسی وقت زور دار گڑگڑاہٹ گونجی۔ سب چونک اٹھے اور ادھر ادھر دیکھا پھر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سامنے موجود پہاڑی بری طرح لرز رہی تھی۔ پھر ایک دھماکہ ہوا اور کئی چھوٹے بڑے پتھر پہاڑی سے اڑتے ہوئے آئے اور ہیلی کاپٹر سے ٹکرائے۔ ہیلی کاپٹر بری طرح ڈگمگایا۔ کئی پتھر تار سے لٹکے ہوئے ندیم کے جسم پر لگے۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"اف خدا۔ اس زمین نے تو پہاڑی کو اڑا دیا ہے۔ پائلٹ فوراً" واپس چلو اگر کوئی پتھر پروں سے ٹکرا گیا تو ہیلی کاپٹر تباہ ہو جائے گا۔" پروفیسر زور سے چلائے۔ پائلٹ نے بوکھلا کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کو موڑا۔ لمبے قد والا لڑکھڑا گیا اور اس کا ہاتھ چرخی کے بٹن پر جا پڑا۔ چرخی تیزی سے گھومی اور ندیم دھپ سے زمین پر جا پڑا۔

"چرخی واپس گھماؤ بے وقوف" پروفیسر خوفزدہ انداز میں چلائے مگر انہیں دیر ہو چکی تھی۔ جونہی ندیم زمین پر گرا۔ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ گئی اور ندیم نمودار ہونے والی گہری دراڑ میں جا گرا۔ فوراً" ہی زمین بند ہو گئی۔ ندیم زمین میں زندہ دفن ہو چکا تھا۔ اس کی کمر سے بندھی تار زمین سے نکلی نظر آ رہی تھی۔ ادھر پائلٹ جو ہیلی کاپٹر کو اوپر اٹھا رہا تھا اسے ایک زوردار جھٹکا لگا کیونکہ چرخی پوری گھوم چکی تھی اور اس کا ایک سرا زمین میں دفن تھا۔ "یہ..... یہ کیا ہوا پروفیسر؟" لمبے قد والا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اسی وقت گڑگڑاہٹ پھر گونجی اور ایک بار پھر کئی پتھر پہاڑی سے اڑتے ہوئے ادھر آئے۔

"فوراً" تار کاٹ دو۔" پروفیسر بولے

"م..... مگر ندیم....." لمبے قد والے کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ پتھر زوردار انداز میں ہیلی کاپٹر سے ٹکرائے تھے۔

"دیر مت کرو۔ تار کاٹ دو۔ ندیم اب ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ اگر ہم نے دیر کی تو ہمارا بھی یہی انجام ہو گا۔" اور لمبے قد والے نے ایک تیز دھار پلاس سے تار کاٹ دی۔ تار لہراتی ہوئی نیچے جا گری۔ اس کے ساتھ ہی پائلٹ نے تیزی سے ہیلی کاپٹر کو آگے بڑھایا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

وہ سب مغموم انداز میں ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

"یہ زمین تو بہت خطرناک ہوتی جارہی ہے۔ اگر بقول پروفیسر یہ زمینی زندگی بڑھنا شروع ہو گئی اور اس کا اثر آبادی والے علاقوں تک پھیل گیا تو......" چیئرمین کہتے کہتے رک گیا۔

"واقعی یہ بات خطرناک ہوگی۔ ہمیں اس سے پہلے ہی کسی طرح زمین میں موجود زندگی کو ختم کرنا ہوگا۔"

"ختم تو جب کریں گے جب ہمیں یہ پتہ چل جائے کہ یہ زندگی ہے کس قسم کی اور اس کے لئے مٹی کا معائنہ ضروری ہے۔ ایک بار ہم اس زندگی کا تجزیہ کرلیں کہ یہ کیسے نمودار ہوئی اور اس کی ہیئت ترکیبی کیا ہے اور اس کا توڑ بھی کیا جاسکتا ہے۔" ایک غیر ملکی سائنسدان بولا۔

"آج صبح اخباروں میں اس واقعے کی اشاعت کے بعد پوری دنیا کے سائنس دان اسی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور بہت سے تو یہاں پہنچ بھی گئے تھے۔

"ایک طریقہ میرے ذہن میں آرہا ہے۔" ایک اور غیر ملکی بولا۔ "وہ کیا!" پروفیسر نے بے چین ہو کر پوچھا'

"یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہم اس زمین پر قدم نہیں رکھ سکتے نہ اسے کھود سکتے ہیں۔ کیوں نہ اس پر بم برسائے جائیں اس طرح گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھے گا اور ہمیں اس طرح اس گرد کو کسی سلنڈر میں محفوظ کرلینا چاہئے۔"

"اوہ طریقہ تو اچھا ہے مگر اس میں خطرہ بہت ہے آپ سن ہی چکے ہیں کہ اس زمین نے ہیلی کاپٹر پر پتھر فائر کئے تھے۔"

"ہاں مگر رسک لئے بغیر تو کچھ نہیں کیا جاسکتا۔" اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کمرہ بری طرح لرزنے لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ "بھاگو۔ زلزلہ آرہا ہے۔" کوئی چلایا۔ سب تیزی سے اٹھے۔ اسی وقت کمرے کی ایک دیوار اور چھت کا کچھ حصہ دھڑام سے گر پڑا۔ سب افراتفری کے عالم میں باہر دوڑے۔ زمین پر بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے' چیختے چلاتے ریسٹ ہاؤس سے نکلے۔ ان کے نکلتے ہی پورا ریسٹ ہاؤس ایک دھماکے سے زمین بوس ہوگیا۔ وہ سب دھک سے رہ گئے۔ اگر انہیں نکلنے میں ایک سیکنڈ کی دیر ہوجاتی تو وہ بھی اس ملبے تلے دفن ہوچکے ہوتے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ وہ غیر ملکی جس نے زمین پر بم برسانے کی تجویز پیش کی تھی وہ دراڑ میں جاگرا۔ (جاری ہے)

کیسے کیسے جانور تھے پرانے زمانے کے

اللہ تعالیٰ نے زمین پر زندگی پیدا کی پھر جیسے جیسے دودھ پلانے والے جانور زمین میں پھیلتے گئے ان کی مختلف شکلیں اور انداز بنتے گئے پرانے زمانے میں اونٹ، ریچھ، کتے، گھوڑے اور ہاتھی تھے۔ ان جانوروں نے کھانے پینے، بچے پالنے اور ان کی حفاظت کے مخصوص طریقے اپنائے۔

کچھ جانور معدوم ہوئے اور کچھ کروڑوں برس کے بعد بھی آج نئے ناموں سے زندہ ہیں۔

فضل حق

فینا کوڈس خیال کیا جاتا ہے کہ گھوڑے کی شکل والا یہ جانور پہلا دودھ والا جانور تھا جو ریوڑ کی صورت میں رہتا تھا۔ اس کے کھر تھے اور دانت ایسے تھے کہ پودے گھاس پھوس کھا سکتا۔ تصویر میں یہ اپنی بیگم اور ایک ننھے میاں کے ساتھ نظر آرہا ہے۔

موروپس گھوڑے کے قد کاٹھ کا یہ جانور پودوں اور جڑوں پر زندہ تھا اس کے پنجے مضبوط اور نوکیلے تھے۔ یہ کھوکھلے تنوں کو دونوں ہاتھوں سے چیر کر اس کی کھال بھی بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ دیکھ لیجیے تصویر میں ایک سوکھے درخت کو چیر کر کیسے خوش ہو رہا ہے آپ بھی نہیں ہوتے ہوں گے اتنا خوش!!

پالیو ٹاپر کچھ کچھ بھینس کی شکل میں ملتا جلتا یہ جانور جو آپ تصویر میں دیکھ رہے ہیں اپنے بچوں کو سانپ کے حملے سے بچا رہا ہے۔ یہ دلدلی علاقوں میں رہنا پسند کرتا تھا۔ اس کی خوراک ہرے پتے اور گھاس پھوس تھی۔ آپ اسے

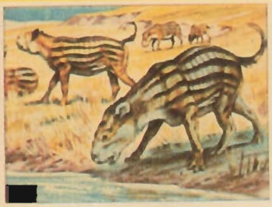

اوریوڈون اسے پرانے زمانے کا اونٹ خیال کیا جاتا تھا۔ یہ امریکہ میں گروہوں کی شکل میں رہتا تھا۔ اس کا پورا جسم سیاہ دھاریوں سے اٹا ہوتا تھا۔ جیسے شیر کے جسم پر دھاریاں ہوتی ہیں لیکن بھئی آپ اس بزدل جانور کو کہیں شیر مت سمجھ لیجیے گا!!!

کوری فوڈرن موجودہ دور کے گینڈے کے مشابہ یہ جانور پانی کے قریب رہائش رکھتا تھا۔ اس کے چار دانت منہ سے باہر نکلے ہوتے تھے۔ یہ پانی میں اگی جھاڑیاں اور لمبی لمبی گھاس کھاتا تھا۔ مزے مزے سے بالکل ایسے جیسے آپ چھابڑی والے سے آلو چھولے کھاتے ہیں۔

تھیوسوڈون پودے کھانے والا یہ جانور اکثر کتوں جیسے تھیلی دار جانور کے حملے کا شکار ہوتا تھا۔ اس کی شکل گیدڑ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی دم خاصی چھوٹی تھی۔ خطرے کی صورت میں ریوڑ میں کھڑے سارے تھیوسوڈون کی دمیں اکڑ جاتی تھیں۔ یہ زیادہ تر سرسبز پہاڑی علاقوں میں رہتا تھا۔

محمد سعید احمد خان

ڈائنوسارز کی حکومت

حضرت آدم سے پہلے زمین پر دیو ہیکل جانوروں کی حکومت تھی

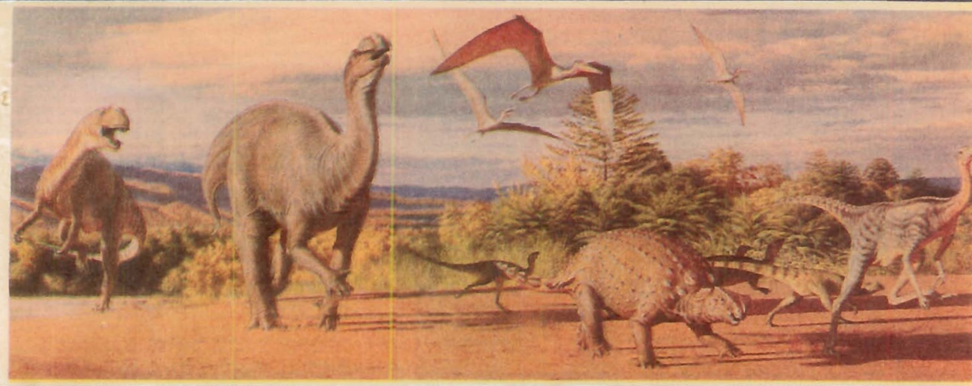

اسٹیگوسارس کی مادہ اپنے بچے کے ساتھ

چیختے چلاتے دوڑتے بھاگتے، زمین کا سینہ دہلاتے چند ڈائنوسارز انہیں دیکھ کر آپ کو ڈر تو نہیں گئے!!

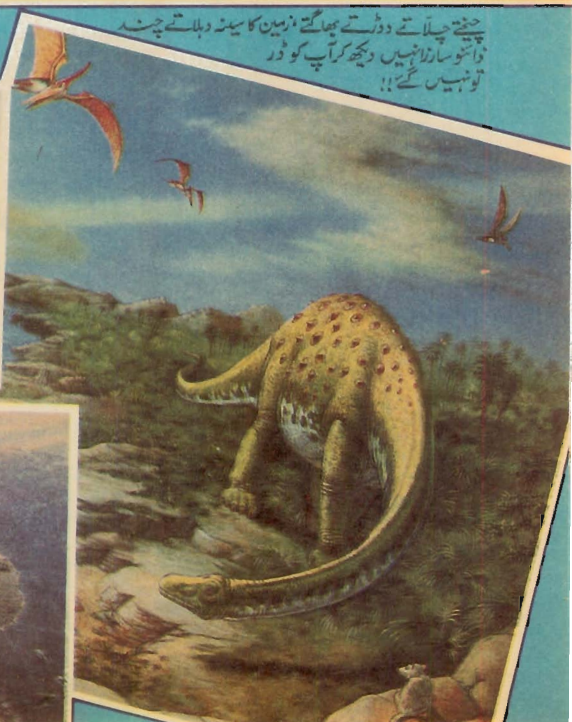

زمین پر زندگی پانی سے شروع ہوئی اور خشکی پر پہنچی۔ کروڑوں سال پہلے جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں بھیجے نہیں گئے تھے، زمین پر دیوہیکل جانور حکومت کرتے تھے۔ بھاری بھرکم تن و توش والے یہ عجیب و غریب جانور رینگنے والے جانوروں میں سے تھے اور انڈے دیتے تھے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ تقریباً" پچیس کروڑ سال پہلے زمین کا سینہ ان بھاری بھرکم جانوروں کے قدموں کی دھمک سے گونجتا رہتا تھا۔

ان کے بارے میں کیسے پتا چلا؟

درخت کیسے اُگتا ہے؟ چاند زمین سے کتنا دور ہے؟ زمین کے نیچے کیا ہے؟ ایسے بہت سارے سوالات انسان کے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور اسے چیزوں کے بارے میں جاننے کے لئے اُکساتے ہیں۔ انسانوں کے تجسّس نے ہی زمین کو کھنگالا تو ڈائنو سارز کے ڈھانچے دریافت ہوئے۔

ان کے ڈھانچے کہاں کہاں دریافت ہوئے؟

ڈائنو سارز کے بارے میں جتنی بھی معلومات سامنے آئی ہیں وہ ان کے ڈھانچوں ہی سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان ڈائنو سارز کے ڈھانچے کنیڈا، شمالی امریکہ، چین، روس، اٹلی اور افریقہ کے بعض علاقوں سے ملے ہیں۔

ڈائنوسارز کس قسم کے جانور تھے؟

ماہرین نے ڈائنوسارز کے ڈھانچوں پر جو تحقیقات کی ہیں ان کے مطابق ان جانوروں کا شُمار ریپٹائلز رینگنے والے جانوروں میں ہوتا تھا اور یہ انڈے دیتے تھے۔ ان کے بچوں کی نشوونما تیزی سے ہوتی تھی۔ نر کی نسبت مادہ ڈائنو سار اپنے بچوں کی پرورش پر خاص توجہ دیتی تھی۔ وہ بچوں کی حفاظت اور نگرانی اس وقت تک کرتی تھی جب تک کہ وہ حالات سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ پرانے ماہرین کی معلومات کے مطابق یہ کم عقل اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے والے جانور نہ تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ماہرین اب بتارہے ہیں کہ یہ نہایت تیز و طرار اور چالاک قسم کے جانور تھے۔ ان میں سے کچھ نہایت بھاری بھرکم جبکہ کچھ نہایت ہلکے پُھلکے جسم کے مالک تھے۔ کچھ اقسام پانی کے قریب رہتی تھی اور ساحلی علاقوں پر اُگی جھاڑیاں، درختوں کے پتے اور ٹہنیاں کھا کر اپنا گزارہ کرتی تھیں جبکہ کچھ اقسام نہایت خطرناک اور جنگجو تھیں۔ یہ گوشت خور ڈائنو سار تھے۔ جب انہیں گوشت کھانے کو نہ ملتا تو یہ اپنے سے کم طاقت والے ساتھی کو مار ڈالتے اور اپنی بھوک مٹاتے ان میں سے کچھ ڈائنو سارز فضاؤں میں اُڑتے پھرتے تھے۔ ان میں برادری طریقہ نمایاں تھا ایک ہی

قسم کے ڈائنوسارز مِل جُل کر رہتے تھے اور جب ان کے ریوڑ ایک ساتھ چلتے تو گرد و غُبار کا ایک طوفان سا اُٹھتا اور زمین ان کے قدموں کی دھمک سے لرز اُٹھتی تھی۔

ڈائنو سار ہاتھی سے بھی کئی گنا بڑے تھے!

ڈائنوسارز قد و قامت اور جسامت میں خاصے بڑے تھے۔ ایک بالغ ڈائنو سار تقریباً" چھ ہاتھیوں کی جسامت کے برابر تھا۔ جو ڈائنو سارز سبزی خور تھے۔ وہ ہر وقت چرتے رہتے تھے اور جنگل کے جنگل ان کی بسیار خوری کا نشانہ بنتے تھے۔ ان کے جبڑے اتنے طاقتور اور مضبوط تھے کہ یہ ڈالیاں اور موٹی ٹہنیاں تک با آسانی چبا ڈالتے تھے۔

سبزی خور برانٹو سارس، براچیوسارس اور ڈپلوڈوکس ڈائنوسارز میں سب سے بڑے تھے۔

ڈائنوسارز کی قسمیں اور عمریں!

ماہرین کا خیال ہے کہ ڈائنوسارز کی بہت سی قسمیں ابھی پوشیدہ ہیں اب تک ان کے جو ڈھانچے مختلف جگہوں سے دریافت ہوئے ہیں ان کے مطابق انسانوں کی بہ نسبت ان کی عمریں لمبی ہوتی تھیں اور یہ کئی سالوں تک جینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

یوں تو ڈائنو سارز کی اب تک ایک سو دس کے قریب نسلیں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں :

ڈپلوڈوکس! :

یہ سب سے بڑا ڈائنو سار تھا۔ اس کی صرف لمبائی تیس میٹر تھی۔ اس کی گردن زرافے کی طرح لمبی تھی۔ جسم موٹا اور فربہ تھا جبکہ دم کی لمبائی بھی گردن سے کچھ کم ہی تھی۔ یہ سبزی خور تھا اور نہایت خوش خوراک واقع ہوا تھا۔

براچیوسارس! :

یہ بھی ڈپلوڈوکس کی طرح لمبا تڑنگا ڈائنو سار تھا اور کافی حد تک زرافے سے ملتا جلتا تھا اس کی صرف اونچائی چالیس فٹ کے قریب تھی جس میں سے گردن کی لمبائی تیس فٹ نمایاں تھی۔ آج کل کے ہاتھی کا وزن چھ یا سات ٹن ہوتا ہے جبکہ اس ڈائنو سار کا وزن اسی سے نوے ٹن کے قریب تھا۔ جسم کی نسبت اس کا سر چھوٹا تھا اور جبڑے کمزور تھے جس کی وجہ سے یہ صرف درخت کے پتے کھا کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ بہت کھاتا تھا اور جنگل کے جنگل صفاچٹ کر جاتا تھا۔

برانٹوسارس :

لمبی گردن اور موٹے تازے جسم کا مالک برانٹو سارس زیادہ تر پانی کے قریب میں رہتا تھا۔ اس کی گردن اتنی لمبی تھی کہ پانی سے باہر بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ سبزی خور تھا۔ لیکن کبھی کبھی

گوشت بھی کھالیتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن گوشت خور ٹرائنو سارس تھا۔

اینٹو سارس :

یہ بھاری بھرکم اور موٹا تازہ ڈائنو سار تقریباً" پینتیس ٹن وزنی تھا۔ ہر وقت چرتے رہنا اس کی عادت تھی۔ یہ سبزی خور تھا لیکن چھوٹے موٹے جانوروں کا گوشت بھی مزے مزے سے کھاتا تھا۔

گرگوسارس :

یہ زیادہ تر ساحلی علاقوں کے قریب گھومتا پھرتا تھا۔ پانی کے اناٹو سارس کا گوشت اس کی مرغوب غذا تھی۔ زیادہ تر اناٹوسارس اس کے حملوں کا نشانہ بنتے۔ یہ بھی بلند و قامت اور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ اس کے دانت بہت تیز اور نوکیلے تھے۔ جس سے یہ شکار کر ادھیڑ ڈالتا تھا۔

پروسوفولس :

لمبا تڑنگا یہ ڈائنو سار بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ اس کے دانت اور جبڑے بے حد طاقتور تھے لیکن یہ درختوں کے پتے اور ڈالیاں چبا کر کھاتا تھا۔ نہایت خوش خوراک واقع ہوا تھا۔ اپنے اگلے پیروں سے ڈالیاں جھکا کر مزے مزے سے پتے اور ٹہنیاں کھاتا تھا۔

ٹرانوسارس :

بھاری بھرکم اور طاقتور جسم کا مالک یہ ڈا
سار نہایت خوفناک تھا اس کے دانت خاصے تی
اور نوکیلے تھے۔ اس کی اونچائی تقریباً" پندرہ ف
جبکہ لمبائی تینتیس فٹ کے قریب تھی۔ اس
اگلے پاؤں بے حد چھوٹے تھے لیکن پچھلی ٹانگی
نہایت مضبوط اور موٹی تھیں۔ یہ دو ٹانگوں
نہایت تیز دوڑتا تھا اور حملے کی صورت میں ا
شکار کو پلک جھپکتے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔

ٹرائیکاٹوپس :

مگرمچھ کی طرح رینگنے والا ٹرائیکا سبزی خ
تھا۔ یہ نہایت بدشکل تھا۔ اس کے سر پر زرہ
طرح کا خول چڑھا تھا۔ منہ کے سامنے سینگ
تھے۔ حملے کی صورت میں یہ سینگوں سے اپنا دفا
کرتا تھا۔

انکائیلوسارس :

اس ڈائنو سار کے جسم پر زرہ بکتر کی طر
کھال چڑھی تھی جو اسے حملہ آور ڈائنو سا
سے محفوظ رکھتی تھی۔ یہ تقریباً" پانچ میٹر لمبا
اس کی دم مگدر نما تھی جو حملہ آور پر ڈنڈے
طرح برستی تھی۔

اسٹیگو سارس :

یہ سبزی خور تھا۔ اس کی لمبائی پندرہ ف
تھی۔ دھڑ کے مقابلے میں اس کا سر خاصا چھ

تھا۔ اس کے جسم پر ہڈیوں کی طرح کے اُبھار تھے۔

کرانوسارس

سمندری ڈائنوسارز میں یہ سب سے لمبا اور ھاری بھرکم ڈائنوسار تھا۔ اس کی لمبائی تیرہ میٹر کے قریب تھی۔ اس کا سر بھی کافی لمبا تھا۔ اس کے تیز اور نوکیلے دانت اس کے بھیانک جبڑوں ں سمائے ہوئے تھے۔ سمندری مچھلیاں اس کی رغوب غذا تھیں۔ اس کے پنکھ اسے تیرنے میں د دیتے تھے۔ یہ خشکی پر بھی آجاتا تھا اور شکار رتا تھا۔

ائمورفوڈن :

اس کا تعلق اڑنے والے ڈائنو سارز میں وتا تھا۔ یہ رھم فرانچس سے خاصا بڑا تھا اور ں کی دم بھی خاصی موٹی تھی۔ یہ زیادہ تر کیڑے لوڑے یا سمندری مچھلیاں کھاتا تھا۔ اس کے ڑے نہایت مضبوط اور دانت خاصے نوکیلے ھے۔

ہم فرانچس :

پتلی اور لمبی دُم والا یہ ڈائنو سار بھی (فضاؤں ں اُڑتا پھرتا تھا۔ مچھلیاں اس کی مرغوب غذا یں۔

روڈکٹائل :

اس کی رہائش براعظم یورپ کی ہے۔ وہیں اس کا ڈھانچہ دریافت ہوا۔ یہ بھی اُڑنے والا ڈائنوسار تھا اور مچھلیاں شوق سے کھاتا تھا۔ اس کے غول پانی کی موجوں کے اوپر مچھلیوں کی تلاش میں اُڑتے رہتے تھے۔ یہ ایک بڑے بگلے کی طرح تھا اور درختوں سے اُلٹا لٹک کر سوتا تھا۔

دنیا سے اچانک ان کی نسل کا خاتمہ کس طرح سے ہوگیا؟

ظلم و لوٹ مار مچانے اور ایک دوسرے کا حق مار کر زندگی گزارنے والے یہ عظیم الجثہ جانور اچانک ختم کس طرح سے ہوگئے؟ ماہرین کا خیال ہے کہ شدید سردی اور برفانی طوفان ان کی نسل کے خاتمے کا باعث بنے۔ وہ مارگنوکیوڈون کو بھی اس سلسلے کی ایک کڑی گردانتے ہیں جو نیولے کی طرح کا ایک میمل تھا اور ڈائنو سار کے انڈے توڑ کر کھا جاتا تھا۔

ایک دلچسپ بات اور بھی سامنے آئی ہے۔ حال ہی میں ماہرین نے شہاب ثاقب کی بارشوں کو ان کی موت کا اصل ذمّہ دار قرار دیا ہے۔ شہاب ثاقب کے بہت سے ٹکڑے ان جگہوں سے ملے ہیں جہاں کبھی ڈائنوسارز کے ڈھانچے دریافت ہوئے تھے!!

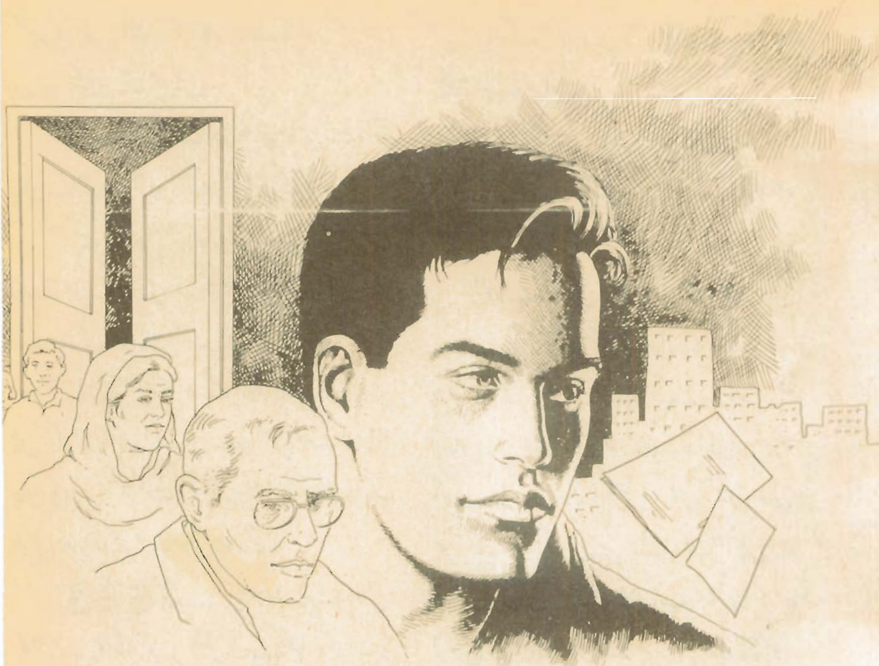

جاؤ نوکری کرو

الطاف حسین

امریکہ کے ورلڈ آرڈر سے دنیا اتنی پریشان نہ ہوئی ہوگی جتنا ابا جان کے حکم سخت نے ہمیں ذہنی کوفت، چڑچڑے پن اور پریشانی سے دوچار کردیا تھا۔ اب نہ ہمیں کھانے میں مزہ آتا تھا نہ سونے میں۔ سوتے ہوئے بھی خواب میں کوئی انتہائی ڈراوٴنی آواز میں ہمیں آرڈر دیتا "جاوٴ نوکری کرو........مفت کی بہت توڑ لی روٹی.....اب ...... جاوٴ ...... نوکری کرو.....جاوٴوٴوٴوٴوٴ!.......جاوٴوٴوٴوٴوٴوٴ........!!"

اور ہم خوف سے کانپتے ہوئے یکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔ جب کئی دن اور راتیں اسی "حال" میں گزر گئیں تو ہمیں اپنا "مستقبل" خطرے میں دکھائی دینے لگا۔ بالآخر ایک دن ہم نے ہمت پکڑی اور دکھوں کی گٹھڑی اٹھا کر یہ سوچتے ہوئے دادا جان کے "آستانے" کی طرف چل دیئے کہ شاید ان کی نظر کرم سے ہمارا یہ "پرابلم" مسئلہ

کشمیر کی طرح التوا کا شکار ہوجائے اور ہم چند دن اور سکون سے جی لیں۔

آداب بجالانے کے بعد ہم خاموشی سے دادا جان کے "روبرو" دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

"کیسے آنا ہوا؟" دادا جان نے پان کا بھرکس نکالتے ہوئے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ ان کے لب مبارک جو کھلے تو منہ میں جمع شدہ "کتھئی مواد" "پھڑچ" کی آواز کے ساتھ ہمارے دامن میں آگرا۔ ہم نے جلدی سے دامن الٹ کر دادا جان کی اس "حرکت" کو "کیموفلاج" کیا اور ایک طویل سرد آہ بھر کر خاموش ہوگئے۔

"چچ چچ چچ چچ......کیا ہوا میرے لال کو؟......بولتا کیوں نہیں!......کیا دکھ ہے تجھے؟......مجھے بتا بیٹا!" دادا جان ہمیں گلے سے لگا کر پچکارتے ہوئے بولے۔ لیکن اگلے لمحے ان کے منہ میں بننے والا تازہ ترین مواد ان سے آؤٹ آف کنٹرول ہو کر ہمارے سر پر گرا اور وہاں سے "اسکیٹنگ" کرتا ہوا ماتھے تک اور پھر ماتھے سے سفر کرتا ہوا ناک کی ٹپ سے دامن داغدار پر ٹپکنے لگا۔ ہم نے دوبارہ دامن کے ذریعے بزرگوں کی نئی غلطی صاف کی اور رو دینے والے انداز میں اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا۔

"دادا جان......وہ لوگ......ہمیں کہتے ہیں کہ......جاؤ نوکری کرو!"

"یہ "وہ لوگ" کون ہیں؟" دادا جان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ابا............ جان......امی .... جان......اور......باجی" ہم نے جھٹ "مشکوک افراد" کی لسٹ پیش کردی۔

"ارے ابھی تیری عمر ہی کیا ہے......برخوردار ابھی تو تمہارے کھیلنے کے دن ہیں نہ کہ نوکری کرنے کے......اللہ بخشے تمہارے پر دادا جان اور ہمارے ابا جان مرحوم کو......انہوں نے تو ہمیں بائیس تئیس سال کی عمر تک تو گھر سے ہلنے تک نہیں دیا تھا......اور......تجھے تیرا باپ کہتا ہے کہ جاؤ نوکری کرو" دادا جان کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے بالترتیب ہمدردی، فخر اور غصے کے رنگ آکر گزر گئے۔ یعنی ہمدردی ہمیں نصیب ہوئی۔ فخر ہمارے پر دادا جان کے حصے میں آیا اور غصے کا اندراج ہمارے ابا جان کے "کھاتے" میں کیا گیا۔

"اچھا دادا جان اب میں جاؤں؟" کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔ کیونکہ "مشن" پورا ہوچکا تھا۔

"ہاں......ہاں......کیوں نہیں......جاؤ بھئی!...... بالکل جاؤ!!" دادا جان نے فراخدلی سے اجازت دیتے ہوئے ہمارے ماتھے پر بوسہ جو دیا تو ہم ماتھے سے ٹھوڑی تک ایک بار پھر "پیک

آلودہ" ہوگئے۔ اُلٹے قدموں آستانے سے باہر نکل کر ہم نے ڈائریکٹ غسل خانے میں رپورٹ کی۔

☆ --- ☆ ---☆

ابھی غسل خانے سے اپنے کمرے میں آئے ہوئے ہمیں بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ باجی نے آکر خبر دی کہ "دادا جان بلا رہے ہیں!" کال ملتے ہی ہم بلا کسی تاخیر کے دادا جان کے حضور جاپہنچے۔ "فاصلہ رکھیں" کے مصداق احتیاط" ان سے ذرا دور ہی کھڑے ہوئے (کیونکہ "برے" وقت کا کوئی پتہ نہیں تھا)

"جی دادا جان! آپ نے ہمیں بلایا ہے؟" ہم نے مودبانہ انداز میں پوچھا۔

جواب میں دادا جان نے ہمیں سر سے پاؤں تک گھُور کر دیکھا۔ (اف! کیا غضب کی نظر تھی آج بھی یاد آتی ہے تو ڈر کے مارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر دُعا سلام کیے بغیر اکیس عدد "صلواتوں" کی سلامی دے ماری۔ ہم ابھی اس "نوازش" سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لپک کر ہمارے قریب آگئے اور ہمارے کان "دست شفقت" سے مروڑتے ہوئے گرامر کے پاک صاف الفاظوں کا ایک زور دار برسٹ مارا اور ہمارا چہرہ "سرخ" ہوگیا (شرم سے نہیں پان کی پیک سے!)

"ارے کمبخت تو......یہ کیا بکتا ہے کہ........نوکری نہیں کرے گا.......اناج کے دشمن!....... ہڈحرام .... شیطان .... موذی .... بدمعاش .... !!!" دادا جان "نوازش خطابات کی رو میں بہتے چلے گئے۔

"یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہوگیا .... دیکھتے ہی دیکھتے جنگل ہرا ہوگیا .... یہ آج ہو کیا رہا ہے ہمارے ساتھ....... ذرا سی دیر میں یہ کیا ہوگیا ہے زمانے کو؟" ہم رومال سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے سوچ کے تانے بانے میں بُری طرح اُلجھ گئے۔

"الّو کے چرخے.......بولتا کیوں نہیں؟.......کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ تجھے ے ے ے ے؟" دادا جان تجھے کی "ے" کو کھینچتے ہوئے غصے سے گرجے۔ تاہم ہم نے سوچ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو یہی دادا جان تھے جو ہم پر ہمدردی کے پھول نچھاور کر رہے تھے اور .... صرف پندرہ منٹ میں انہوں نے کتنی دیدہ دلیری سے اپنے سارے "خلوص کا جلوس" نکال کر رکھ دیا .... کیا بزرگوں کے جسم میں کوئی بدروح گھس آئی ہے جو ہماری روح کی دشمن ہے .... یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کسی "دشمن" نے ہمیں دادا جان سے "مذاکرات" کرتے ہوئے دیکھ لیا اور بات

"اوپر" تک پہنچادی اور پھر پوری ٹیم نے مل کر دادا جان کے چھوٹے چھوٹے کان ہمارے خلاف بھر دیئے ہوں.......ہاں.......بالکل یہی ہوا ہوگا....... جبھی تو دادا جان کے رویّہ کی گنگا اُلٹی بہہ رہی ہے۔"

"ابے گونگے کی اولاد! .... کچھ منہ سے بھی پھُوٹ .... کیا تیرا سامان سے لدا جہاز غرق ہوگیا ہے .... بول .... کیوں نوکری نہیں کرے گا؟"

انہوں نے چھڑی کا مُڑا ہوا سرا ہماری گردن میں پھنساتے ہوئے غصے سے کہا۔ اسی اثنا میں گھر کے باقی ممبرز بھی ہماری بے بسی کا "مُفت" تماشہ دیکھنے کی غرض سے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

قصہّ مختصر دادا جان کی خرافات سُننے اور اگلے دن سے نوکری تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد ہم صفر پر آؤٹ ہوجانے والے کھلاڑی کی طرح مایوس سرجھکائے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے "ذلّت کدہ" سے باہر نکل آئے اور اپنے کمرے میں جاکر دیر تک دادا جان کے رویّے اپنی رُسوائی اور بے بسی پر خاموش ماتم کرتے رہے۔

☆ --- ☆ --- ☆

اگلے دن صبح فجر کی نماز پڑھ کر اللہ کے حضور گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی فتح کے لئے دعا کی اور ناشتے سے فارغ ہوکر سیدھے فیجے نائی کی دکان پر پہنچے۔ اخبار آچکا تھا۔ ہم نے اخبار اُٹھالیا۔ ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فلاں سیاست دان بیرون ملک دورے پر کیوں جارہا ہے؟ فلاں سیاستی کو کسی جرم کی پاداش میں "بند" کردیا گیا ہے؟ ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت میں کمی کا سبب کیا ہے؟ پاکستانی کرکٹ ٹیم آج کل خلفشار کا شکار کیوں ہے؟ وغیرہ وغیرہ ہماری دلچسپی کا محور تو صرف اور صرف اشتہارات کا صفحہ تھا۔ ہم نے مذکورہ صفحہ کو اچھی طرح "ریڈ" کر دیکھ لیا لیکن مطلب کی کوئی آسامی کسی کالم میں دکھائی نہ دی توکل کی امید پر گھر لوٹ آئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

بالآخر فیجے نائی کی دکان پر مسلسل حاضری کے پانچویں دن "اشتہاری صفحہ" دیکھتے ہوئے ہماری خوردبینی نظریں ایک اشتہار پر ٹھہر گئیں۔ مطلب کا اشتہار دکھائی دینے پر پہلے تو ہم نے خوشی سے بغلیں بجائیں اور پھر دائیں کان پر لگی پینسل اتار اشتہار سے پتہ نوٹ کیا اور اگلے ایک گھنٹہ دوران "کاغذی کاروائی" مکمل کرکے حوالۂ ڈاک کردی اور اُنگلیوں کی پوروں پر "انتظار" کے گھنٹے گننا شروع کردیئے۔ ہمیں پورا

یقین تھا کہ انٹرویو لیٹر بس کچھ ہی عرصے بعد ہم تک پہنچا چاہتا ہے۔

ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ تین ہفتے بعد ہی ہمیں کلرکی کے انٹرویو کا کال لیٹر موصول ہوگیا اور یہ ناقابل یقین خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے خاندان کے کانوں تک پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہماری سلیکشن ریجیکشن کے متعلق کھسر پھسر کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ کوئی کہتا "بہت مشکل ہے! یار تم بھی انہونی باتیں کرتے ہو تھرڈ ڈویژن انٹرپاس کو بھلا کون سلیکٹ کرے گا۔ بابے اپنے کو یہ کیس ریجیکٹ دکھائی دیتا ہے" تو کوئی نفی میں سرہلاتے ہوئے یوں گویا ہوتا "ہمیں تو کسی طور پر بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی" اور کوئی ہمارے حق میں یہ حوصلہ افزا بیان جاری کرتا "اگر اللہ نے صاحبزادے کا رزق اس محکمہ میں لکھ دیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی کیونکہ آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا!!" (کتوں کے بھونکنے سے فقیروں کے رزق میں کمی نہیں آتی)۔

غرضیکہ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ لیکن ہم یہ سب کچھ خاموشی سے سُنتے رہے اور کسی کے بیان پر ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ہمیں تو بس اس دن کا شدت سے انتظار تھا جس دن ہم نے انٹرویو کے لئے جانا تھا۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے بالآخر وہ دن آہی گیا۔ جب ہم صبح سویرے اللہ کو یاد کرتے ہوئے حصولِ روزگار کی اس کٹھن مہم کو سرکرنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پتہ پوچھتے پوچھتے نو بجے اپنے ہونے والے دفتر پہنچے۔ انٹرویو کے "پھانسی گھاٹ" سے صدر دروازے تک امیدواروں کی ایک انتہائی لمبی زگ زیگ لائن لگی ہوئی تھی۔ ہم نے بھی اپنا "جسدِ خاکی" اس "شیطانی آنت" سے نتھی کرلیا۔

"یہ قطار کیوں نہیں چل رہی ہے؟" ہم سے آگے کھڑے امیدوار نے اگلے سے لائن جام ہونے کی وجہ پوچھی۔

"یار وہ افسر ہی ابھی تک دفتر نہیں پہنچا جس نے ہمارا انٹرویو کرنا ہے!"

"اب تو انہیں ہفتے میں دو دن آف ملتے ہیں پھر بھی یہ لوگ وقت پر دفتر نہیں آتے۔"

"وہ آئے گا تو خود ہی پوچھ لینا!"

"ہم ان دونوں کے باہمی تبادلۂ خیال پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ خیر صاحب پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق ٹھیک دس بجکر بیس منٹ پر افسر نے دفتر کو رونق بخشی اور آدھ گھنٹہ ستانے کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

جاری ہے

بُرا مت مانئے گا آپ سے اتنی گُزارش ہے
کہ جینا چاہتے ہیں ہم' ہمیں جینے کی خواہش ہے
سدا مِل جُل کے رہنا چاہتے ہیں ہم کو رہنے دیں
ہمیں اک دوسرے کی بات سُننے اور کہنے دیں
ہم اپنا عہد' اپنی سوچ' اپنے شوق رکھتے ہیں
سنواریں گے وطن کو' اپنے اندر ذوق رکھتے ہیں

☆ .... ☆ .... ☆

ہمیں سمجھایئے مت فرق دیہات اور شہروں کا
نہیں ہوگا اثر ہم پر اُترتی چڑھتی لہروں کا
ہر اک صوبہ ہمارا ہے' ہر اک قریہ ہمارا ہے
کہیں گے فخر سے اک دن' وطن ہم نے سنوارا ہے
ہمیں پنجاب' سرحد' سندھ سے یکساں محبّت ہے
ہمیں کشمیر کی وادی سے بے پایاں محبّت ہے
ہمیں چکوال' گلگت' خیبر و مکران پیارے ہیں
ہمیں میدان میں رہ کے بھی ریگستان پیارے ہیں
بلوچستان کا پانی ہمارا اپنا پانی ہے
کسی کو اس سے کیا؟ یہ گھر کے اندر کی کہانی ہے
ہمارا فلسفہ اپنا' ہمارا عہد اپنا ہے

ہماری اپنی آنکھیں ہیں ہمارا اپنا سپنا ہے

☆ .... ☆ .... ☆

ہمارے رنج و غم جو بانٹنے آئے وہی اچھا
ہمارے ساتھ جو مِل بانٹ کر کھائے وہی اچھا
ہمارے ساتھ جو دیکھے حسیں سپنے وہی اپنا
جو ہم سے یہ کہے سب لوگ ہیں اپنے وہی اپنا
مہاجر ہوں کہ سندھی دل میں اک قرآن رکھتے ہیں
خُدا رازق ہمارا' اس پہ ہم ایمان رکھتے ہیں
ہمیں نفرت کے ہر جلتے الاؤ کو بُجھانا ہے
وطن ماں ہے' ہمیں آغوشِ مادر میں سمانا ہے
دلوں میں ہم بہت جذبے بہت ارمان رکھتے ہیں
ہمارا ایک ہے قصّہ ہم اک عنوان رکھتے ہیں

☆ .... ☆ .... ☆

ملاؤ ہاتھ' ہم ناقابلِ تسخیر بن جائیں
پھنساؤ انگلیوں میں اُنگلیاں زنجیر بن جائیں
چلو اک بار ہم آواز ہو کے مل کے سب گائیں
اور اپنے دَور کے دانش وروں کو آج بتلائیں
اندھیرے راستوں کو جگنوؤں سے جگمگاتی ہے
محبت روشنی ہے' روشنی رستہ دِکھاتی ہے

ناقابلِ یقین

ایم۔ اعجاز احمد

۱۷ فروری ۱۹۶۷ء کو لاہور کے شیشہ موتی بازار کی ایک گلی میں مقیم ۸۰ سالہ غریب عورت رحمت بی بی فوت ہوئی۔ اس غریب عورت کو محلّے کے لوگ کھانا وغیرہ دیا کرتے تھے۔ انھوں نے کفن دفن کے لئے پولیس کو اطلاع دی۔ لوہاری پولیس نے جب بوڑھی غریب عورت کے مکان کی تلاشی لی تو یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ مکان میں موجود کاٹھ کباڑ میں سونے کی کئی اینٹیں موجود ہیں۔ ان اینٹوں کا کل وزن ۷۳ تولے کے قریب تھا۔

مکان سے نیشنل بنک کی ایک پاس بک بھی ملی جس کے مطابق رحمت بی بی کے ۱۱ ہزار ۵۰۰ روپے بنک میں جمع تھے۔ ان کے علاوہ ایک حویلی اور ۲۰ مکانات کی رجسٹریاں بھی اس کے پاس سے ملیں جو اس کے نام تھیں۔ یہ مکانات لُدھیانہ (بھارت) کے ایک محلّے لکڑ منڈی میں تھے۔ اس عورت کا کوئی وارث نہ ہونے کے باعث حکومت نے تمام قیمتی سامان اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

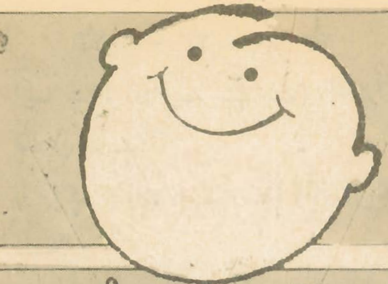

ہنستے ہنستے

ایک بچہ (اپنے کنجوس باپ سے) آج میں نے ہزار ہزار کے اتنے نوٹ دیکھے کہ گنتے گنتے آنکھ تھک گئی۔"

کنجوس باپ : "گننے کی کیا ضرورت تھی فوراً بینک میں جمع کرادیتے۔"

مرسلہ : نوید اختر، کراچی

مالک (دیہاتی نوکر سے) "تمہیں آئے ہوئے ابھی جمعہ جمعہ چار دن بھی نہیں ہوئے اور تم نے تین کرسیاں توڑ دیں۔" نوکر نے معصومیت سے کہا۔ "سرکار! آپ ہی نے تو کہا تھا مجھے ایک مضبوط نوکر کی ضرورت ہے۔"

مرسلہ : وسیم بن ضمیر، مکران

☆ --- ☆ --- ☆

ایک شخص (شریر بچے سے) "تم نے کبھی کوئی نیکی کا کام بھی کیا؟"

شریر بچہ : "کیوں نہیں! ایک بار ہمارے پڑوسی ریلوے اسٹیشن جارہے تھے۔ وقت بہت کم تھا گاڑی آنے والی تھی۔ میں نے ان کے پیچھے اپنا کتا چھوڑ دیا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور وقت پر اسٹیشن پہنچ گئے۔

مرسلہ : شہیر بن ضمیر، پسنی

☆ --- ☆ --- ☆

عینک ساز کی دکان میں ایک صاحب داخل ہوئے اور عینکیں دیکھنے لگے دکان دار نے ان کی پسند کی عینک نکال دی لیکن غلطی سے اس عینک میں دوربین کے شیشے لگادیئے۔ وہ صاحب عینک پہن کر باہر نکلے تو سامنے ایک انگور والا انگور بیچ رہا تھا۔ وہ صاحب اس کے پاس گئے اور کہا۔ "بھائی! دو غبارے تو دینا!"

مرسلہ : سید محمد اسامہ، راولپنڈی

☆ --- ☆ ---☆

ایک بچہ : (دوسرے بچے سے) "تمہارا خاندان کیسا ہے؟"

دوسرا بچہ : (منہ بناتے ہوئے) "جانوروں کا ہے۔"

پہلا بچہ : (حیرت سے) "وہ کیسے؟"

دوسرا بچہ : "وہ ایسے کہ امی مجھے اُلو کہتی ہیں ابو گدھا کہتے ہیں' ماسٹر صاحب بندر اور دادا جان شیر کہتے ہیں۔"

مرسلہ : صدف مظفر' راولپنڈی

☆ --- ☆ ---☆

ایک انگریز نے ایک پاکستانی سے بڑی نخوت سے پوچھا۔ "کیا تم جانتے ہو ایک گدھے اور ایک پاکستانی میں کیا فرق ہوتا ہے؟" پاکستانی بولا۔ "نہیں معلوم۔" انگریز نے کہا۔ "یہ فرق ہوتا ہے کہ پاکستانی لالچی ہوتا ہے اور گدھا لالچی نہیں ہوتا پھر وہ انگریز نے دوبارہ سوال کیا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے ایک گدھے اور ایک انگریز میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

پاکستانی نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ "میرے خیال میں کوئی نہیں۔"

مرسلہ : اسد اللہ' کراچی

☆ --- ☆ ---☆

ایک دوست (دوسرے سے) "آج میں نے ایک فقیر کی جان بچائی۔"

دوسرا : "وہ کس طرح؟"

پہلا : "میں نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو دس روپے دے دوں تو کیا ہوگا؟ اس نے جواب دیا.... بابو جی! میں خوشی سے مرجاؤں گا۔"

دوسرا : "پھر تم نے کیا کیا؟"

پہلا : "میں نے اسے دس کا نوٹ دکھا کر جیب میں واپس رکھ لیا۔"

مرسلہ : کاشف' کراچی

☆ --- ☆ ---☆

استاد : "سال میں کتنے موسم ہوتے ہیں؟"

شاگرد : "چار"

استاد : "شاباش! کون کون سے؟"

شاگرد : "میچ' امتحانات' الیکشن اور ہڑتال!"

مرسلہ : فہد احمد شجراہ' جیکب آباد

☆ --- ☆ ---☆

بادشاہ (شاہی مسخرے سے) "اچھا ہوا تم آگئے اس وقت میرا دل کسی مسخرے سے گفتگو کو چاہ رہا تھا۔"

مسخرہ : "میں بھی یہی سوچ کر آپ کے پاس چلا آیا تھا۔"

عبدالوحید' حیدر آباد

☆ --- ☆ ---☆

ایک بادشاہ اپنے محل سے نکلا۔ دیکھا ایک شاعر

بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا۔ "کیا جھوٹ گھڑ رہے ہو۔"
شاعر نے کہا۔ "حضور کی تعریف!"

مرسلہ : انس، کراچی

☆--- ☆ ---☆

"بھائی جان! میرا خیال ہے جو صاحب نچلی منزل پر رہتے ہیں انہیں میرا ستار بجانا بہت زیادہ پسند ہے۔"
"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"انہوں نے مجھے ایک تیز چاقو دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے ستار بجانا پھر دیکھنا کیا ہوتا۔"

مرسلہ : ارقم، کراچی

☆--- ☆ ---☆

ایک صاحب کو اپنے تیسرے صاحبزادے کا نام رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ اپنے دوست کے پاس پہنچے اور کہا کہ نام دونوں صاحبزادوں کے ناموں سے ملتا جلتا ہونا چاہئے۔ دوست نے پوچھا۔ "دونوں کا نام کیا ہے؟" انہوں نے کہا۔ "ایک کا نام ہے صدیق الزماں جالینوس اور دوسرے کا ہے عتیق الزماں کیکاؤس۔" یہ سن کر ان کے دوست مسکرائے اور بولے۔ "بہت خوب! آپ کے تیسرے صاحبزادے کا نام ہونا چاہئے بندوق الزماں کارتوس۔"

مرسلہ : محمد ریاض، حیدر آباد

مریض : (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب! میں ہر بات بھول جاتا ہوں۔ کوئی علاج بتائیے۔"
ڈاکٹر صاحب یہ سن کر گھبرا گئے جلدی سے بولے۔ "آپ پہلے میری فیس دے دیجئے علاج بعد میں کروں گا۔

مرسلہ : محمد اصغر احمد خان

☆--- ☆ ---☆

ایک کنڈیکٹر کو سوتے میں جملے دہرانے کی عادت تھی مثلاً "ڈبل ہے استاد! جانے دو۔ او بھائی گیٹ سے اوپر آ۔" ان کے ایک قریبی رشتہ دار ملنے آئے اور رات انہی کے گھر سوگئے۔ آدھی رات کو ان رشتہ داروں کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کافی دیر تک ضبط کرتے رہے بالاخر بول اٹھے۔ "اب تو خاموش ہوجاؤ۔" کنڈیکٹر نے رٹا رٹایا جملہ دہرایا :
"بہت بول رہے ہو پچاس پیسے کا ٹکٹ لے کر کیا پوری بس پر قبضہ کرو گے۔"

مرسلہ : اسما بتول، کراچی

☆--- ☆ ---☆

ایک شخص اسٹاپ پر کھڑا کافی دیر سے بس کا انتظار کررہا تھا۔ ایک تولیا بیچنے والا اس کے قریب آیا اور تولیہ خریدنے کی فرمائش کی۔ اس شخص نے انکار کردیا۔ وہ شخص جتنا انکار کرتا تولیا

والا اتنی ہی ضد کرتا۔ جب اس کا اصرار بہت بڑھ گیا تو تنگ آکر اس شخص نے تولیے کی قیمت پوچھی جو تولئے والے نے دس روپے بتائی۔ "اس پر منافع کتنا ہوتا ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ تولئے والے نے کہا "صرف آٹھ آنے۔"

اس آدمی نے جلدی سے جیب سے آٹھ آنے نکالے اور کہا۔ "تم اپنے آٹھ آنے کے لئے میرے ساڑھے نو کیوں خراب کرتے ہو یہ لو آٹھ آنے اور میرا پیچھا چھوڑو۔"

مرسلہ : مقصود، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک دوست نے اپنے کام چور دوست سے پوچھا۔ "کیا صرف جیب میں ہاتھ ڈال کر مارے مارے پھرنے سے تمہاری زندگی بسر ہو سکتی ہے؟"

کام چور دوست نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اپنا ہاتھ دوسروں کی جیبوں میں ہو۔"

مرسلہ : عظمیٰ مصطفیٰ، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک اسکول انسپکٹر ایک اسکول کا معائنہ کرنے گئے۔ وہاں اسکول کے عملے نے بچوں کو مختلف سوالوں کے جواب رٹا دیئے۔ تیسری جماعت کے ایک بچے کے ذمہ یہ سوال تھا "ہمیں کس نے بنایا ہے؟" اب اتفاق دیکھئے یہ بچہ معائنے والے دن اسکول نہ آسکا۔ انسپکٹر اسکول نے تیسری جماعت سے سوال کیا۔ "ہمیں کس نے بنایا ہے۔ کلاس میں خاموشی چھائی رہی۔ انسپکٹر نے سوال دوبارہ دہرایا۔ ایک بچہ ڈرتا ڈرتا کھڑا ہوا پھر بڑی معصومیت سے بولا۔ "سر! جسے خدا نے بنایا تھا آج وہ غیر حاضر ہے۔"

مرسلہ : عالیہ، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

استاد (شاگرد سے) "بتاؤ! انگریزوں نے ہندوستان میں پہلا قدم رکھنے کے بعد کیا کیا؟"

شاگرد نے جواب دیا۔ "سر! انہوں نے دوسرا قدم رکھا۔"

مرسلہ : محمد عرفان صدیقی، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

دہلی کے ایک مشاعرے میں عبدالحمید عدم مرحوم پنڈت ہری چند اختر کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئے اور کہنے لگے۔ "پنڈت جی! آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں عدم ہوں۔"

پنڈت جی ان کا موٹا تازہ جسم دیکھ کر شوخی سے بولے۔ "اگر یہی عدم ہے تو وجود کا کیا حال ہوگا؟"

مرسلہ : رضوانہ، کراچی

مصحف رسول کے شوخ کارٹون

شکر خدا کا... تم آگئے... ہم بہت دیر سے مریض کو بے ہوش کرنے کے منتظر تھے..!!

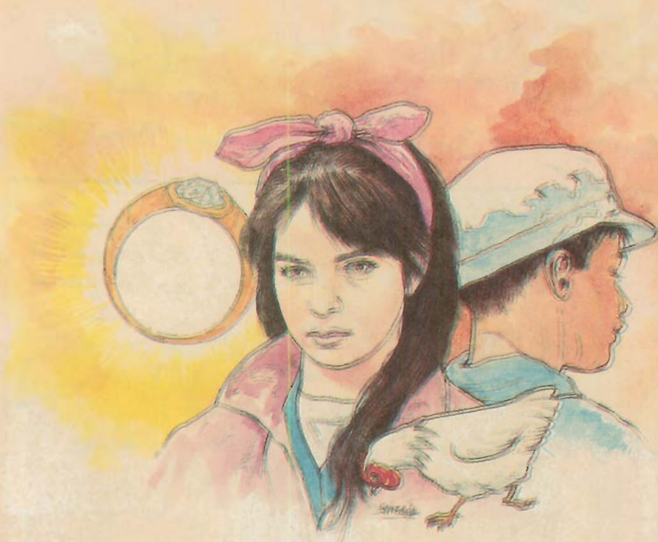

پومی اور پونی کی کہانی

محمد شہزاد خان کستوری

پومی لڑکا تھا اور پونی لڑکی۔ خوبصورت سی چھوٹی سی اس کی رنگت گلابی سی تھی اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے۔ پومی اس سے دو سال بڑا تھا۔ وہ بہت محنتی بچّہ تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ دونوں کے ماں باپ مر چکے تھے۔ ان دونوں کے گھر ساتھ جُڑے ہوئے تھے اور گھر کے سامنے بہت بڑی کیاریاں تھیں جس میں پومی نے گوبھیاں، گاجریں اور آلو اُگائے ہوئے تھے۔ یہی ان کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ گوبھیاں اور گاجر اُگا کر بازار میں بیچ دیتے تھے۔ ان سے کچھ پیسے مل جاتے جس سے وہ کیک اور پھل لے آتے مگر اتنے پیسے انہیں پھر بھی نہیں ملتے تھے کہ وہ اس سے کپڑے اور جوتے خرید سکیں یا اسکول کی نئی کتابیں خرید لیں۔ انہیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ بستی کے لوگ انہیں پُرانی کتابیں دے دیا کرتے تھے۔ ویسے ایک بات تھی۔ پومی زیادہ محنتی تھا اور پونی کم۔ سچّی بات تو یہ تھی کہ پونی کو کھانے پینے اور آرام کی زیادہ فکر رہتی

تھی۔ آج صبح بھی جب چمکتے ہوئے سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو پومی بیدار ہوگیا۔ اس نے خُدا کا شکر ادا کیا اور باہر آکر اپنی کیاری کو دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا کہ اب کہ کوئی گوبھی نہیں اُگی تھی اور صرف پانچ گاجریں اچھی ہوئی تھیں جو کہ وہ آج کھالے گا۔ "خیر اللہ کا شکر ہے۔" پومی نے کہا۔ وہ پریشان نہیں ہوتا تھا۔

"اُفوہ! یہ پونی اب تک نہیں اُٹھی؟" وہ پونی کے گھر گیا اس کی کیاری سوکھی پڑی تھی اور وہ کمبل اوڑھے سورہی تھی۔ کمبل جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پومی کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہی ہے۔

"اُٹھو، پونی! گرم سورج ہمارے لئے نکل آیا ہے۔" پونی اداسی سے اُٹھ بیٹھی۔ اس نے ایک نظر اپنے امّی ابو کی تصویر پر ڈالی جو اسے چھوڑ کر جاچکے تھے۔ پھر اس نے اپنے اس مرتبان کو دیکھا جس میں وہ کاجو اور بادام رکھتی تھی۔ سردی زوروں پر تھی اور اب اس میں صرف چھ بادام اور ایک کاجو رہ گیا تھا۔ جبکہ کوئی گاجر بھی نہیں اُگی تھی۔ "ارے آؤ ناں" پونی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسے میں اس کی نظر اس گرم مفلر پر پڑی جو بیگم فرحین نے اسے ترس کھا کر دیا تھا۔ اگر میں اسے بیچ دوں تو شاید اچھے پیسے مل جائیں۔ اس نے سوچا اور مفلر لے کر باہر آگئی۔ پومی اسکول کا لباس پہنے اس کا انتظار کررہا تھا۔ "ارے پونی تم اسکول نہیں جاؤ گی؟" پومی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں میرے جوتے پھٹے ہوئے ہیں سب بچّے میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

ہاں بے چاری...... پومی نے دل میں سوچا مگر وہ کربھی کیا سکتا تھا خود اس کے جوتے بھی پھٹے ہوئے تھے اور بچّے اس کا بھی مذاق اُڑاتے تھے مگر وہ کافی بہادر تھا اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

خیر! پونی وہ مفلر کانوں پر لپیٹے بازار میں آگئی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ مفلر کس کو بیچوں۔ اتنے میں دلدار بھائی نظر آئے وہ انڈے اور ڈبل روٹی بیچا کرتے تھے۔

"دلدار بھائی! کیا آپ یہ مفلر مجھ سے خریدیں گے؟"

دلدار بھائی نے دیکھ کر کہا۔ "ہاں! میں اس کے بدلے تمہیں ایک انڈہ! دے سکتا ہوں۔"

"صرف ایک انڈہ! اس سے اچھی تو میری مرغی تھی دو انڈے دیا کرتی تھی۔"

"تمہاری مرغی ہے بھئ!" دلدار بھائی نے بُرا سا منہ بنایا۔

پونی کو غصّہ آیا اور وہ آگے چل دی۔ اسے کامران چچا نظر آئے۔ کامران چچا "یہ مفلر خرید لیں!"

"کتنے میں دو گی بھئ!"

اتنے میں کہ ان پیسوں سے میرے نئے جوتے آجائیں اور میرا شیشے کا مرتبان کاجو سے بھر جائے۔"

کامران چچانے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "میں تمہیں تین کاجو اور ایک تھیلی چلغوزے دے سکتا ہوں۔"

"بس!"

"ہاں بس!"

"نہیں نہیں مجھے نہیں دینا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"سنو! میں تمہیں ایک بڑا اخروٹ بھی دوں گا۔"

نہیں چاہئے مجھے! یومی نے روہانسی آواز میں کہا۔

اسے لوگوں کی خودغرضی پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ کر مفلر کو غور سے دیکھا۔ اس کو کونے میں سے چوہے نے کتر لیا تھا اور بیچ میں استری سے جلا ہوا تھا۔ اب اسے بیگم فرحین پر غصّہ آنے لگا جس نے اتنا خراب مفلر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سامنے کا منظر دُھندلا گیا۔

"کیا ہوا پیاری بچی؟" ایک سفید بالوں والی بوڑھی عورت اسے دیکھ رہی تھی۔ "تم یہ مفلر بیچنا چاہتی ہو ناں۔ لاؤں مجھے بیچ دو۔ اس کے بدلے میں تمہیں ایسی انگوٹھی دوں گی جسے پہن کر تمہاری ہر خواہش پوری ہوجائے گی۔"

"سچ!" یونی اچھل پڑی اس نے بڑی بی کو مفلر دے دیا اور ان سے انگوٹھی لے کر واپس آگئی۔ خوشی کے مارے وہ بھاگتی ہوئی گھر آئی۔ تو یومی اسکول سے آچکا تھا اور منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔

"یومی! دیکھو میرے پاس ...... انگوٹھی ..... جادو کی؟" خوشی کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

یومی نے حیرانی سے سُنا۔ "دیکھو! میں اسے کہوں گی کہ میرا مرتبان کاجو سے بھردو۔ تو یہ بھر دے گی۔"

"اچھا......؟" یومی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں! اے انگوٹھی مرتبان کاجو سے بھردو۔"

دوسرے ہی لمحے مرتبان کاجو سے بھر گیا۔

"ارے واہ!" یونی نے خوشی سے تالی بجائی۔ یومی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے نئے جوتے لاؤ۔"

چمکتے ہوئے نئے جوتے بھی آگئے "ہُرّے!"

میری کیاری گاجروں سے بھر جائے اور سنہری مرغیاں آجائے کڑاک کوں کڑاک۔ ایک مرغی نہ جانے کہاں سے آن گری اور کیاری بھی ہری بھری ہوگئی تھی۔ اب یونی ناچ رہی تھی یومی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

یومی! تمہیں بھی کچھ منگوانا ہے؟" اس نے بڑی شان سے پوچھا۔

"ہاں مجھے یہ سنہری مرغی دے دو۔" اس نے للچائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ یہ میں نہیں دوں گی تم دوسری لے لو۔ یہ کہہ کر اس نے کہا۔ "ایک اور مرغی لاؤ!"

ایک اور مرغی آگئی۔ مگر یہ سفید تھی۔ "نہیں مجھے سنہری مرغی دو۔"

"کیوں یہی لے لو ناں۔"

"نہیں نہیں سنہری چاہیے۔"

اچھا لو "مرغی لاؤ" مگر پھر مرغی سفید ہی تھی۔

"افوہ!" وہ اُکتا گئی مگر پھر اس کے ذہن میں ترکیب آئی۔

"پانچ مرغیاں دو۔"

اکھٹی پانچ آگئی۔ "یہ لو پانچوں تم لے لو!" پونی سے خوشی سے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے یہی سنہری چاہیے۔"

"پانچ اور......!"

"یہ لو اب یہ دس کی دس تم لے لو۔"

مگر پومی اڑ گیا تھا۔ "مجھے یہی سنہری چاہیے۔"

"میں تمہیں اور دلوا دیتی ہوں۔ کیا تم سنہری مرغی چھوڑ نہیں سکتے۔؟"

"نہیں!"

"اچھا لو بیس۔" اب کے تو اکٹھی بیس مرغیاں آگئی تھیں۔ پورا گھر مرغیوں سے بھر گیا تھا۔ مگر پومی اب بھی چلّا کر کہہ رہا تھا۔

"سو بھی منگا دو تب بھی نہیں۔"

پونی یہ سُن کر رونے لگی۔ "نہیں میں مرغی نہیں دوں گی۔ گندے کہیں کے تم اور لے لو۔ تم اور لے لو"

اب تو اس نے پچاس کی فرمائش کی اور جب پچاس مرغیاں اور آگئیں تو گلی بھی مرغیوں سے بھر گئی۔ "نہیں نہیں" پومی چلّایا۔

اچھا بھاڑ میں جائے۔ یہ سب تمہاری مرغیاں بھی۔ پونی نے روتے ہوئے کہا۔ دوسری ہی لمحے سب غائب ہو گیا۔

مرغیاں، انگوٹھی، جوتے

پونی اور پومی حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔

اُرے ارے یہ کیا ہوا؟؟"

پونی نے دیکھا اس کے جوتے پُرانے اور پھٹے ہوئے ہیں کیاری سوکھی ہے اور مرتبان میں چھ بادام اور ایک کاجو اس کا منہ چڑا رہے ہیں۔

گھر کے دروازے پر سنہری رنگ کا ایک کاغذ اُڑتا ہوا آیا پونی اور پومی نے لپک کر اس کو اُٹھایا اور پڑھا سنہرے حروف سے لکھا تھا :

"جو لوگ مِل کر نہیں رہتے، لڑتے جھگڑتے ہیں انہیں کچھ نہیں ملتا!!"

پونی اور پومی یہ پڑھ کر بے حد شرمندہ ہوئے۔ اس دن کے بعد وہ کبھی نہیں لڑے۔

ہم جشن منائیں گے

عبدالقادر

دُنیا کو مُسلماں کی ہم شان بتائیں گے
اقبالؒ کے خوابوں کے تعبیر دِکھائیں گے

اس شہر کراچی کو گلزار بنائیں گے
پھر پیار و محبّت کے ہم پُھول کِھلائیں گے

رستے سے کدورت کی دِیوار گِرائیں گے
رُوٹھے ہوئے بھائی کو سینے سے لگائیں گے

اے پاک وطن تُجھ پر اللہ کی رحمت ہو
ماتھے پہ تِرے جھومر اک روز سجائیں گے

ہم قوم کے بچّے ہیں، کمتر نہ ہمیں سمجھو
دل میں جو اِرادے ہیں، وہ کرکے دِکھائیں گے

ٹُوٹا ہے وطن اپنا، نظریں بھی ہوئیں نیچی
چہرے سے خجالت کے ہم داغ مِٹائیں گے

ہرگام پہ دشمن نے سو دام بِچھائے ہیں
ہم اس کے عزائم کو مٹّی میں مِلائیں گے

"ایمان و عمل پیہم، تنظیم و یقیں محکم"
ہم قائدِ اعظمؒ کا پیغام سُنائیں گے

مُدّت سے بھنور میں ہے، شرمندہ ساحل ہے
اس قوم کی کشتی کو ہم پار لگائیں گے

مغموم و پریشاں ہیں جو لوگ زمانے میں
ہم ان کو سنبھالیں گے، روتوں کو ہنسائیں گے

دامن میں وطن کے ہم خوشیوں کے گُہر بھر کے
آزاد فضاؤں میں اِک جشن منائیں گے

سب سے بڑی ضرورت

شیخ عاکف حمید

انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں رہنے سہنے کے طریقے بالکل سادہ تھے۔ اسی وجہ سے لوگوں کی ضرورتیں بھی کم اور چیزیں مختصر ہوتی تھیں۔ ہر شخص اپنی ضرورت کی چیز اپنی کوشش اور محنت سے حاصل یا تیار کر لیتا تھا اس کو کسی دوسرے سے کوئی چیز لینے یا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی پھر جیسے جیسے انسانی تہذیب میں ترقی ہوتی گئی انسان کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں۔

اب تجربے نے یہ بتایا کہ ہر انسان تنہا اپنی کوشش اور محنت سے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں تیار نہیں کر سکتا۔ چند چیزیں تو وہ خود پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن باقی ضروریات کے لئے دوسروں کا

محتاج ہے۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر شخص صرف ایک قسم کا کام کرنے لگا۔ کوئی کاشت کاری کرنے لگا،کسی نے کپڑا بننا شروع کر دیا،کسی نے جوتے بنانے شروع کر دیئے اور کسی نے بڑھئی کا پیشہ اختیار کیا۔ غرض ہرایک نے کوئی کام شروع کر دیااور اپنی بنائی ہوئی چیزیں دے کراس کے بدلے دوسروں سے اپنی ضرورت کی ہرچیزاناج کے بدلے حاصل کرنے لگا۔ اسی طرح جولاہا کپڑوں کے بدلے اور موچی جوتوں کے بدلے اپنی ضرورت کے لئے دوسری چیزیں لینے لگا۔ چیزوں کے آپس میں تبادلے کے اس نظام کو مال کے بدلے مال (بارٹر سسٹم) کہا جاتا ہے۔

اس نظام کے رواج سے انسان کو اپنے علاوہ دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور زندگی میں نیا لطف اور رنگا رنگی پیدا ہوتی گئی۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیااس نظام سے بھی دشواریاں پیش آنے لگیں۔ ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ ہر شخص کوایک ایسا آدمی تلاش کرنا پڑتا تھاجواس کی بنائی ہوئی چیزیں لے لےاور اس کے بدلے اس کی ضرورت کی چیزیں دے دے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ناریل کے درختوں کی کاشت کرتا ہے اور اسے ایک بکری کی ضرورت ہے اب اسے ایک ایسے شخص کی تلاش کرنا ہے جس کے پاس بکری ہو تاکہ وہ ناریل لے کر اس کے بدلے میں بکری دینے کو تیار ہو جائے۔

ظاہر ہے اس قسم کی تلاش میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ ایسااتفاق بہت کم ہوتا تھا کہ دوایسے افراد مل جائیں جن کو ایک دوسرے کی چیز کی ضرورت ہو۔ پھراس ادل بدل میں یہ سوال بھی پیدا ہونے لگا کہ ایک چیز کے مقابلے میں دوسرا اپنی کتنی چیز دے یعنی کتنے ناریل کے بدلے ایک بکری دی جائے اس قسم کی مشکلات سے بچنے کے لئے انسان نے ایک ایسی چیز یاایک ایسے ذریعے کی تلاش شروع کی جو چیزوں کے تبادلے کا معیار بن سکے۔ یعنی جس کے بدلے لوگ اپنی چیزیں فروخت کرنے اور خریدنے کے لئے تیار ہوں۔

آخر کار بڑی تلاش کے بعد قیمتی دھاتوں، مثلاً سونے اور چاندی کواس مقصد کے لئے منتخب کر لیا گیا کیونکہ ایک تو یہ دھاتیں ملتی بہت کم تھیں اور دوسرے فائدے کے لحاظ سے بھی بہت اہم تھیں۔ ضرورت کے وقت لوگ ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیتے اور اپنی مرضی کی چیز مقرر کی ہوئی مقدار میں حاصل کر لیا کرتے اب وہ پریشانی ختم ہو گئی کہ اگر بکری خریدنی ہے تو اسے کسی کے پاس معلوم کرنے کے لئے نہیں جانا پڑتا تھا، بلکہ ضرورت کے وقت وہ مقرر کردہ چاندی کے بدلے بکری خرید لیتا۔

سونے چاندی کو چیزوں کے ادل بدل یا تبادلے کا معیار بنانے سے خرید و فروخت میں کافی آسانیاں پیدا ہو گئیں، لیکن کچھ عرصے بعد کچھ لوگوں نے دھات کے کھوٹے اور جعلی ٹکڑے اس مقصد کے

لئے استعمال کرنے شروع کر دیئے جس کی وجہ سے عام اور سیدھے سادھے لوگوں کے لئے خاصی پریشانی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ دھوکے بازی سے بچنے کے لئے حکومت نے دھات کے ٹکڑوں کو سکوں میں ڈھالنے کا طریقہ اختیار کیا، یعنی ٹکڑوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر ان پر مہریں لگائی جانے لگیں اور آہستہ آہستہ یہ سکے رواج پانے لگے اور جعلی دھاتی ٹکڑوں کا خطرہ بڑی حد تک ٹل گیا ایک زمانے میں کوڑیاں بھی سکوں کی طرح استعمال ہوا کرتی تھیں۔

لیکن کاروباری دنیا میں بہت ساری رقم کے لئے زیادہ سکے سنبھالنے پڑتے تھے اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں خاصی پریشانی اٹھانی پڑتی تھی اس دقت کو دور کرنے کے لئے حکومت نے کاغذوں کے نوٹ جاری کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح روپے پیسے کا استعمال عام ہوتا چلا گیا۔ موجودہ کرنسی نوٹ اور سکے اس پرانے نظام کی ترقی یافتہ شکل میں جو مختلف زمانوں، مختلف حالات اور مختلف مرحلے طے کرتے ہوئے موجودہ شکل میں آپ کے پاس موجود ہیں۔ ان سے آپ جب چاہیں اور جو چیز چاہیں بلا کسی دقت کے بآسانی خرید سکتے ہیں۔

لیکن آج کے دور میں بھی تجارت کے لئے عام چیزیں تبادلے کا معیار بن رہی ہیں مثلاً تمباکو، نمک، کھالیں تبادلے کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں اور پھر جنگ عظیم ہونے پر یورپ میں چیزوں کے تبادلے کا معیار سگریٹ بنے رہے۔ یعنی سگریٹوں کے عوض لوگ اپنی پسندیدہ چیزیں خرید سکتے تھے۔ سگریٹ براعظم افریقہ یا دور دراز کے علاقوں میں آج بھی چیزوں کے تبادلے کا معیار ہیں گویا یہ سکے یا نوٹ کا کام کرتے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ روپیہ پیسہ ہی تبادلے کا معیار ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تبادلے کا ایسا معیار جس سے چیزوں کا آپس میں تبادلہ ہو سکے اور وہ چیز مقبول عام یا ہر ایک کی ضرورت کی بھی ہو۔

معذرت

فروری کے شمارے میں شائع ہونے والی عید کی نظم محترمہ افشاں بشیر صاحبہ کی تھی۔ غلطی سے اس پر اے بشیر چھپ گیا جس پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔

اسی طرح کچھ عرصہ پہلے کے ایک شمارے میں فرقان وہاب کے کارٹون شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک کارٹون محمد علی انصاری کا تھا۔ ادارہ ان کے توجہ دلانے پر ان سے معذرت خواہ ہے۔

ہیمپٹن کورٹ کی بھول بھلیاں

غلام عباس طاہر

بھول بھلیاں یورپ کے کئی ممالک میں موجود ہیں۔ لیکن ہیمپٹن کورٹ کی بھول بھلیاں بہت مشہور ہے۔ آج ڈیوڈ اور ایڈمنڈ دونوں دوستوں کا ہیمپٹن کورٹ کی بھول بھلیاں کی سیر کا ارادہ تھا۔ ڈیوڈ کا خیال تھا کہ یہ بھول بھلیاں نہایت سادہ ہیں۔ ٹکٹ لے کر دونوں دوست اندر داخل ہوئے۔ کلرک نے بھول بھلیوں کا نقشہ بھی انہیں دے دیا۔ ڈیوڈ نقشہ دیکھ کر بولا۔ "یہ تو سادہ سا پارک ہے بس ہر موڑ پر دائیں ہاتھ مڑتے جاؤ اور واپسی پر ہر موڑ پر بائیں ہاتھ مڑتے جاؤ۔ دس منٹ بعد ہم باہر آجائیں گے۔" جب دونوں اندر داخل ہوئے تو بہت سے لوگ اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے لیکن انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے "میں تو اب اتنا تھک گیا ہوں کہ مرنے کے قریب ہوں۔"

ڈیوڈ بولا "پھر پریشانی کی کیا بات ہے میرے ساتھ چلیں میں آپ کو باہر کا راستہ دکھاتا

ہوں۔" ایک بڑے میاں ڈیوڈ کو دُعائیں دینے لگے کہ "آپ تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں چلئے ہماری رہنمائی کیجئے۔"

راستے میں بہت سے لوگ ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے وہ بھی ڈیوڈ کے پیچھے ہو گئے یعنی ایک جلوس سا بن گیا کئی لوگ تو گھنٹوں سے بھٹک رہے تھے اور اب ناامید ہو چکے تھے ان میں ایک بڑی بی بھی شامل تھیں۔ ڈیوڈ ہر موڑ پر بائیں ہاتھ مڑ جاتا بہت دیر چلنے کے بعد آخر ڈیوڈ بھی تھک گیا اور باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ اب ہر طرف سے ڈیوڈ پر لعن طعن ہونے لگی۔ بڑی بی اور بڑے میاں جو پہلے دُعائیں دے رہے تھے اب بددُعا دے رہے تھے۔ وہ غصّے میں بولے جا رہے تھے "تم نے ہمیں بے وقوف بنایا، ہم نے تم پر بھروسا کیا لیکن تم تو دھوکے باز نکلے۔" ڈیوڈ نقشہ نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک صاحب نے نقشہ لے کر دیکھا تو اُچھل پڑے، بولے "اس چکردار راستے سے باہر نکلنے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے ہم وسط میں جائیں پھر نکلیں گے۔" دس منٹ چلنے کے بعد سب وسط میں پہنچ گئے وہاں بینچ لگے ہوئے تھے کئی آدمی تو تھک ہار کر بینچوں پر گر پڑے۔ ان صاحب نے ایک بار پھر نقشے کا معائنہ کیا اور کہا کہ آؤ میرے ساتھ۔" پندرہ منٹ چلنے کے بعد ایک دفعہ پھر سب وسط میں آپہنچے۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے ایک اور صاحب نے نقشہ دیکھ کر کہا "یہ تو بے حد آسان ہے آؤ" ان صاحب کا بھی وہی حشر ہوا۔ ایک بار پھر سب وسط میں تھے۔ اب تو یہ تماشا بار بار ہونے لگا۔ ڈیوڈ نے ایک دفعہ پھر جیب سے نقشہ نکالا تو بڑے میاں کا پارا چڑھ گیا۔ وہ چیخ کر بولے "میاں! اس نقشے کو تم بھاڑ میں ڈالو خبردار جو اب نقشہ نکالا۔" اِدھر اُدھر کچھ دیر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سب لوگ پاگلوں کی طرح پکارنے لگے "اے میاں چوکیدار! اللہ کے واسطے ہمیں یہاں سے نکالو۔" چوکیدار جو ایک نو عمر سا لڑکا تھا آیا اور سب کو لے کر اپنے ساتھ چلنے لگا وہ تھوڑے دن پہلے ہی بھول بھلیوں میں ملازم ہوا تھا۔ کافی دیر گھوم پھر کر وہ بھی مرکز میں آنکلا وہ بہت پریشان تھا یعنی خود بھی راستہ بھول چکا تھا۔ ایک بڑے میاں غصّے کے مارے اس چوکیدار کو مارنے کے لئے لپکے لیکن لوگوں نے انہیں پکڑ لیا۔ آخر اللہ اللہ کر کے ان بھول بھلیوں کا اصلی چوکیدار آیا۔ اور اس نے سب کو باہر نکلنے میں مدد دی بڑی بی اور بڑے میاں کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے "توبہ جو اِدھر کا کبھی رُخ کیا اپنی اولاد کو بھی وصیت کریں گے کہ اِدھر نہ آنا۔" ڈیوڈ اور ایڈمنڈ مشکلوں سے تھکے ماندے گھر پہنچے تو بستر پر گرتے ہی سو گئے۔

شرارت کی سزا

ندیم اختر

یہ واقعہ بالکل سچا واقعہ ہے اور میرے بڑے بھائی کے ساتھ پیش آیا جو بہت شرارتی لڑکا تھا اور ہر کسی کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ بھائی کو دوسروں کو تنگ کرنے میں بہت مزا آتا تھا اور وہ ہروقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ کب کس کو تنگ کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ابو اسے بہت دفعہ ڈانٹ چکے تھے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ بھائی نے شرارت کرنا ہی چھوڑ دی۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ ایک پاگل عورت ہمارے محلے میں سے گزری تو بھائی نے اسے پاگل پاگل کہہ کر تنگ کرنا شروع کردیا پہلے تو اس نے بھائی کو گالیاں دیں۔ بھائی نے اس کی اس گستاخی پر اسے ایک پتھر مارا، جو اس کے پاؤں پر لگا پھر اس پاگل عورت نے بھائی کو بددعا دی کہ اللہ کرے تو کسی کار کے نیچے آکر مرجائے۔ اسی شام بھائی موٹر سائیکل پر جارہا تھا کہ سامنے سے کار آگئی۔ بھائی نے بریک لگائی لیکن نہ لگی۔ شاید اس پاگل عورت کی بد دعا قبول ہونا تھی اس طرح ایکسیڈنٹ ہوگیا اور اس ایکسیڈنٹ میں میرے بھائی کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اسی دن انہوں نے اللہ سے معافی مانگی اور کہا کہ آج کے بعد میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔

ایک سچا واقعہ

سید فضل ودود

آنکھ مچولی کے شمارے اگست ۱۹۹۰ء میں صفحہ نمبر ۶۳ پر سانپ کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ پڑھنے پر خیال آیا کہ میرے ساتھ بھی

۱۹۴۰ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا۔ لیکن اس کو لکھنے کی تحریک نہیں ہوئی۔ آنکھ مچولی رسالہ کے نونہالوں کے مطالعہ لئے میں اسے قلم بند کر کے اشاعت کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ نام اور مقامات بھی حقیقی ہیں۔

میں دسمبر ۱۹۳۶ء سے اکتوبر ۱۹۴۸ء تک بارہ سال ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرتا رہا۔ اس دوران راولپنڈی ڈویژن میں پشاور سے لالہ موسیٰ تک مین لائن اور متعلقہ برانچ لائنوں میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر کئی ہفتوں اور کئی مہینوں تک ڈیوٹی دیتا رہا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں منڈی بہاؤ الدین کے قریب ملک وال جنکشن پر دو ماہ مجھے محمد شفیع ٹرین کلرک کی جگہ کام کرنے کا حکم ہوا۔ جو چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ محمد شفیع صاحب نے جاتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ تم غیر شادی شادہ نوجوان ہو تو ریمونگ لاج میں رہنے کی بجائے میرے کوارٹر میں قیام کرو۔ جس سے گھر کے سامان کی حفاظت بھی ہوگی اور تمہیں وسیع مکان میں رہنے کی سہولت ہوگی۔ پھر میں نے عبدالرشید صاحب کے مشورہ پر ان سے مکان کی چابی لے لی۔ ریلوے کالونی میں کوارٹروں میں رہنے والے ملازمین اکثر غیر مسلم تھے۔ میں سرحد کا رہنے والا اور علاقے میں نوارد تھا۔ اس لئے آس پاس کے رہنے والے مکینوں سے کوئی

خاص واقفیت نہیں ہوئی۔ ڈیوٹی ختم کر کے کوارٹر میں آجاتا۔ کتابیں پڑھتا اور سو رہتا۔ ایک دن شام چار بجے سے رات ۱۲ بجے تک آٹھ گھنٹے ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد واپس کوارٹر میں آیا تو خیال آیا کہ کام کی مصروفیت میں نماز عشا پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سونے سے قبل نماز ادا کی جائے۔ گرمی کا موسم تھا۔ کیوں نہ تازہ وضو کر کے قبلہ رخ ہوں۔ لیکن بیت الخلا میں جونہی قدم رکھا تو اچانک ہیبت ناک پھنکار کی آواز آئی۔ اندھیرا تھا باہر نکل کر لالٹین تلاش کیا اور بتی جلا کر بیت الخلا میں مشاہدہ کرنے لگا کہ پھنکار کیسے آئی۔ اندر قدم رکھا اور خیال تھا کہ اندر جائزہ لوں۔ ذہن میں آواز کی مشابہت سے اندازہ کیا تھا کہ یہ گوہ ہوگی۔ جس کو پشتو میں غرندونے یا سانپ کی ماں کہتے ہیں۔ یہ چھپکلی کی قسم کا جانور جسامت

میں گرگٹ یا چھپکلی سے سوگنا بڑا ہوتا ہے اور کاٹا نہیں کرتا۔ جب غسل خانے میں پاٹ کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تو دائیں طرف اینٹوں کے ٹکڑوں میں چمک دیکھ لی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک چار پانچ فٹ لمبا سانپ اینٹوں کے ٹکڑوں میں لیٹا ہوا ہے اور ایک فٹ کے قریب گردن اور پھن اٹھائے میری طرف دیکھ کر بار بار زبان نکال رہا ہے۔ میرا فاصلہ اس سے نصف گز کے قریب تھا۔ میں تحیّر اور تعجب میں فوراً" پیچھے ہٹ آیا اور مکان میں ڈنڈا' لوہا یا بھاری چیز تلاش کرنے لگا تاکہ اس کی مدد سے سانپ پر حملہ کردوں اور اسے ماردوں۔ مکان اور وارانڈے میں پوری تلاشی کے بعد تنور کے ساتھ پڑی ایک پتلی ٹہنی مل گئی.... مچھردانی باندھنے والی بانس کی پتلی چھڑی۔ حیران تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ ایک بجے کہاں سے ہتھیار حاصل کروں۔ مزید تلاش کے بعد چار انچ لمبی اور نصف انچ چوڑی لوہے کی ایسی پٹی مل گئی جو ریلوے اسٹیشن میں جنگلے کے طور پر لگائی جاتی ہے۔ یہ پٹی لمبائی میں ڈیڑھ گز اور وزن میں کئی سیر تھی۔ لیکن چپٹی تھی گول نہیں تھی کہ میں ہاتھ میں مضبوط پکڑ کر اس کو مارنے کے لئے استعمال کروں۔

اب میرے دماغ میں یہ سوال تھا کہ سانپ تو اینٹ کے ٹکڑوں میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے رات کی خاموشی اور اندھیرا بھی ہے۔ میں دونوں ہاتھوں سے لوہے کی یہ وزنی پٹی پکڑ کر الجھے ہوئے سانپ پر ضرب لگادوں۔ تنور کے پاس پڑی گز بھر سیخ میں نے قریب رکھ لی۔ لالٹین ایسی جگہ رکھی کہ اس کی روشنی سانپ کے پھن اور اس کی آنکھوں پر پڑے۔ کئی بار ریہرسل کرکے اللہ کا نام لے کر دونوں ہاتھوں سے ڈنڈا اونچا کرکے سانپ کے اوپر ضرب لگادی۔ پھر بائیں ہاتھ سے اس پر دباؤ ڈالے رہا اور دائیں ہاتھ میں لوہے کی سیخ لے کر مستعد رہا کہ اگر ضرب سے سانپ پھنس گیا تو وہ میری طرف نہیں آسکے گا۔ میری ترکیب بھی ناسمجھی کی تھی۔ لوہے کہ پٹی بھی زیادہ مضبوطی سے ضرب نہیں لگاسکتی تھی۔ لیکن میں نے اس ترکیب پر عمل کرلیا۔ دائیں ہاتھ میں سیخ لے کر میری طرف بڑھتے ہوئے سانپ کے سر پر مارنے کی کوشش کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد تھی کہ ہاتھ ہلاتے ہلاتے دو تین بار میرا سیخ زور سے سانپ کے سر پر پڑنے میں کامیاب ہوا اور وہ مضمحل ہو کر فرش پر گر پڑا۔ میں نے دس بارہ مزید اس کے سر پر لوہے کی پتلی سیخ سے ضربیں لگائیں اور اپنے خیال میں اسے مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بیت الخلا کو میں نے استعمال نہیں کیا۔ کوارٹر کے باہر تازہ وضو کیا اور جب نماز عشا ادا کی تو رات کے دو بجے تھے۔ اس نماز میں جو لطف آیا اس کی

لذت و فرحت اب ۵۵ سال گذرنے کے بعد بھی محسوس کرتا ہوں۔ صبح سویرے جب نماز فجر ادا کی اور بیت الخلا میں سانپ کو دیکھنے گیا تو وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ اس پر اور بھی حیرت ہوئی۔ سانپ اپنی جگہ سے ایک گز دور جاکر مر گیا تھا۔ غالباً جانکنی کے عالم میں اس نے رینگنے کی کوشش کی تھی۔

خاموش

رفعت شازیہ

یہ واقعہ آج سے چند سال پہلے کا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز ہم اور ہماری خالہ جان بازار سے خریداری کر کے گھر واپس لوٹ رہے تھے۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں چلی جا رہی تھیں۔ چلتے چلتے ایک لڑکی نے دوسری کو مخاطب کر کے کہا۔

"حمیرا! ذرا تیز تیز چلو' ڈرامہ شروع ہونے والا ہو گا۔"

"ارے ہاں! سنا ہے بڑا اچھا ڈرامہ نشر ہو رہا ہے۔" دوسری لڑکی نے کہا اور دونوں تیز تیز چلنے لگیں۔

ان دونوں کی باتیں سن کر ہماری خالہ جان جو کہ ٹیلی وژن ڈراموں کی بہت شوقین ہیں' بے چین ہو گئیں اور جب ان سے رہا نہ گیا۔ تو لڑکیوں سے پوچھ بیٹھیں۔

"اے بیٹا! آج کون سا ڈرامہ آئے گا۔"

"خاموش!" ایک لڑکی زور سے بولی۔ اتنا سننا تھا کہ ہماری خالہ جان جن کا غصہ سارے خاندان میں مشہور ہے' بری طرح بھڑک اٹھیں۔

"بدتمیز' بے شرم تجھے کسی نے بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں سکھایا۔ لو ذرا دیکھو' میں نے ڈرامے کا نام کیا پوچھ لیا مجھے کہتی ہے "خاموش!"

خالہ جان زور و شور سے گرج رہی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی گھبرا گئی تھیں۔

"ارے آنٹی پلیز! ذرا سنیئے تو' میں تو' آپ کو......"

وہ لڑکی بے چاری بار بار کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر خالہ جان اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ آخر جب انہوں نے دیکھا کہ خالہ جان کچھ سننا نہیں چاہ رہیں تو دونوں نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔

اس سے پہلے کہ وہاں پر لوگ جمع ہوتے' ہم نے بڑی مشکل سے خالہ جان کو سمجھایا بجھایا' ان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور انہیں لے کر گھر آ گئے۔

ہم نے خالہ کو چائے بنا کر دی۔ ٹی وی والے کمرے میں چھوٹا بھائی اسلم بیٹھا ہوا اسکول کا کام

کررہا تھا۔

"اے بیٹا! ذرا ٹی وی تو کھولنا۔ میرا موڈ تو تبدیل ہو۔" خالہ جان نے چائے پیتے ہوئے اسلم سے کہا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی کھول دیا۔

"آج کونسا ڈرامہ آئے گا اسلم!" ہم نے پوچھا۔

"خاموش!" اسلم نے ہمیں گھور کر کہا۔ اور اس کے ساتھ اس کی پیٹھ پر خالہ جان کی جوتی زور سے لگی۔

"ارے کمبخت! نالائق بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تجھے' کیا زمانہ آگیا ہے۔ ادب اور تمیز تو ان لوگوں کو چھو کر نہیں گزری۔" خالہ جان ایک بار پھر برس رہی تھیں۔ ادھر اسلم صاحب گلا پھاڑ کر رو رہے تھے اور ہم بیچ میں حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ اسلم کے رونے کی آواز سن کر امی دوسرے کمرے سے دوڑی چلی آئیں۔ انہیں جب ساری بات معلوم ہوئی تو اسلم کو سمجھاتی اور چپ کراتی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

"چھوڑیئے خالہ جان' رہنے دیجئے۔ بچہ ہے' امی اسے سمجھا دیں گی۔ بس اب آپ غصہ تھوک دیں۔" ہم نے ایک بار پھر بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر خالہ جان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور ان کا دھیان ٹی وی کی طرف لگادیا جہاں ایک اشتہار چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں بعد اسکرین پر ایک اناؤنسر نمودار ہوئی جو کہہ رہی تھی' "آیئے ناظرین نئی ڈرامہ سیریل "خاموش" کی پہلی قسط دیکھتے ہیں۔"

"ہم نے چونک کر خالہ جان کو اور انہوں نے ہمیں دیکھا' دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور اس سے پہلے کہ ہمارے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکلتا ہم کمرے سے نکل گئے۔

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگوائیں؟

ہمیں قارئین کے ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں وہ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانے کا طریقہ کار دریافت کرتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانا چاہتے ہیں تو ان شماروں کی تفصیل، نصف قیمت کا منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتا ہمیں روانہ کردیجئے۔ ہم پرچے آپ کو بھجوادیں گے۔

خط وکتابت کے لئے پتا:

مینجر سرکولیشن، ماہنامہ آنکھ مچولی I-پی آئی بی کالونی کراچی ۵ فون: ۴۹۴۲۸۵۷، ۴۹۴۸۲۱۰

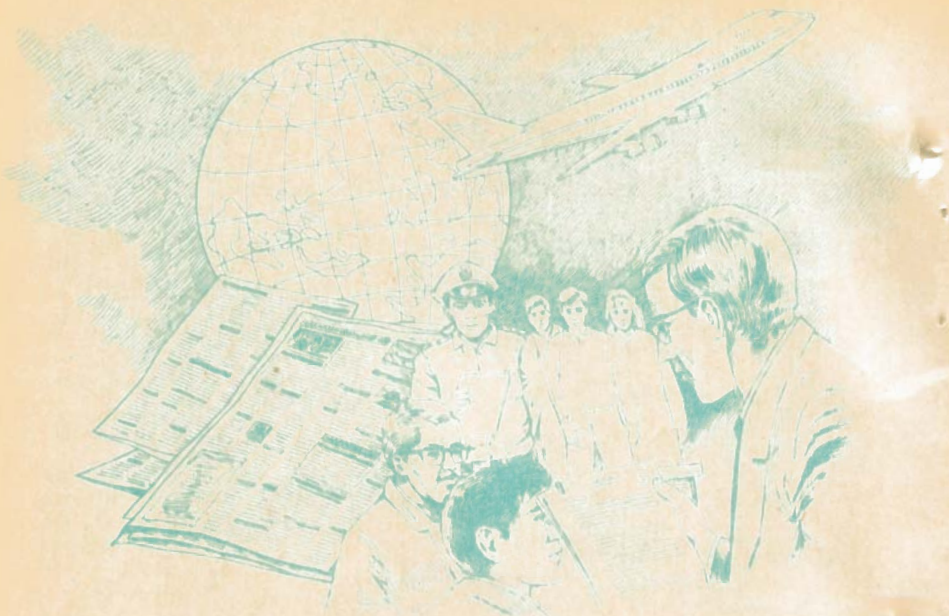

صرف ایک سیکنڈ میں

عابدہ قریشی

سیکنڈ........ ایک سیکنڈ......... صرف ایک سیکنڈ وقت کی ایک انتہائی قلیل سی مدت کو کہتے ہیں یہ مدت کتنی جلدی گزر جاتی ہے۔ شاید اس پر کبھی غور نہ کیا ہو۔ وہ قلیل سی مدت جسے ہم سیکنڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اِس کا انسانی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے اِنسانوں اور حیوانوں کے جسم میں بعض عمل اتنی تیزی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگتا ہے۔ دنیا کے اکثر سائنس دانوں نے ایسے بہت سے تجربے کیے ہیں جس میں انسانوں اور حیوانوں کے پھُرتیلے پن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کا ہاتھ بجلی کے تاروں کو چھُو جائے تو وہ سیکنڈ کے آٹھویں حصّے کے اندر اندر ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ یہ عمل غیرارادی طور پر ہوتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ایک سیکنڈ کو اگر پانچ حصّوں میں برابر تقسیم کردیا جائے تو ایسے تین حصّوں میں بہترین شکاری دس گز کے فاصلے سے شکار کو نشانہ بنا سکتا ہے۔

"انسان ایک سیکنڈ کے چالیسویں حصے میں پلک جھپک لیتا ہے۔ انسانی چھینک کا عمل ایک سیکنڈ کے دسویں حصّے میں پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

ایک مشہور ناول نگار کا کہنا ہے کہ "یورپ کے دو پہلوان کشتی لڑ رہے تھے۔ دس سیکنڈ کے اندر اندر ایک نے دوسرے کو پچھاڑ دیا اور اس عرصے میں میرا ذہن ایک مکمل ناول کے خاکے کو ترتیب دے چکا تھا۔"

لندن کے ایک مشہور چڑیا گھر میں ایسے منظر کی فلم بندی کی جارہی تھی۔ جس میں ایک مینڈک نے ایک چھوٹے سے کیڑے کو نگلنا تھا۔ فلم لینے کے لئے جو کیمرہ استعمال کیا جارہا تھا۔ ڈائریکٹر نے کیمرہ اون (ON) کرنے کا حکم دیا اور دیکھنے والوں نے صرف اتنا دیکھا کہ مینڈک نے زبان چلائی اور کیڑا غائب ہوگیا۔ یہ سین اتنی تیزی سے ہوا کہ انسانی آنکھ مشاہدہ نہ کر سکی۔

ایک ماہر کا کہنا ہے کہ گرگٹ نہ صرف رنگ بدلنے میں مشہور ہے بلکہ زبان کی پھرتی کا جو مظاہرہ کرتا ہے شاید کوئی اور جانور نہ کرسکے۔ گرگٹ اپنے سے ایک فٹ پر اُڑتی مکھی کو نصف سیکنڈ سے بھی کم وقت میں چٹ کر جاتا ہے۔

ایک شکاری کے بیان کے مطابق وہ ایک بار جنگل میں ایک ہرن کو چشمے سے پانی پیتا دیکھ رہا تھا...... کہ اچانک چیتا ایک گز کے فاصلے سے حملہ آور ہوا، حملے سے پہلے چیتا غرّایا اور ہرن نے یہ آواز سُن لی۔ وہ اسی وقت چوکنا ہوگیا۔ چیتا ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت میں اس جگہ جست لگا چکا تھا۔ لیکن ہرن اس سے بھی پہلے غائب ہوچکا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ چیتا غصّے کی حالت میں ہو تو اس وقت ایک سیکنڈ میں ایک سو تیس فِٹ لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔

اگر انسان خاص کر طالب علم طبقہ اپنی روزمرہ کی زندگی پر نظر ڈالے تو بھی اسے سیکنڈ کی حقیقت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ مزدور ایک بلند عمارت پر کام کررہے تھے۔ اچانک ایک مزدور کا پاؤں پھسلا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر آگیا یہ سب کچھ اتنی جلدی عمل میں آیا کہ انسانی ذہن کچھ سوچنے سے محروم رہا۔ چنانچہ سیکنڈ زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ سیکنڈ کو نظرانداز نہ کریں کیونکہ ضرب المثل مشہور ہے۔

"گیا وقت ہاتھ آتا نہیں"

ایک پرانی کہانی

مہوش سکندر

یونانی لوک ادب سے انتخاب

بادشاہ مداس (KING MIDAS) کو سونا بہت پسند تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات بے قس (BACCHUS) سے ہوئی جو یونانی خداؤں میں سے ایک تھا۔ مداس نے ایک دفعہ اس کی مدد کی تھی جس کے نتیجے میں بے قس نے اسے تحفے کی پیشکش کی تھی اور کہا تھا "میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں، جو تمہیں خوش کر دے۔"

مداس نے چند لمحے سوچا تھا پھر اس نے کہا "میری خواہش ہے کہ میں جس چیز کو بھی چھوؤں وہ سونے کی ہو جائے تم مجھے ایسی طاقت دے دو۔"

بے قس نے یہ سن کر قہقہہ لگایا پھر وہ رضامند ہو گیا اور اس نے مداس کو کہا کہ جب وہ صبح اٹھے گا تو اسے یہ "طاقت" مل چکی ہوگی۔ پھر جب مداس اگلی صبح جاگا تو بے قس نے اپنے لفظوں کا پاس رکھ لیا تھا۔

صبح سب سے پہلے جو بات مداس کو محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ اس کے بستر کی چادر روز کی طرح ہلکی اور

نرم نہیں تھی۔ چادر کی طرف دیکھنے پر اس پر یہ انکشاف ہوا کہ بستر کی چادر سونے کی بن چکی ہے۔ اور یہی حال اس کے تکیہ کا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے پلنگ کے پائیوں کو چھوا تو وہ بھی سونے کے بن گئے۔ مداس خوشی کا نعرہ لگا کر بستر سے باہر نکل آیا۔

جب اس نے کپڑے پہنے تو اس کی شاہی پٹی جو سبز اور سرخ رنگ کی تھی وہ بھی سونے کی بن گئی، بلکہ اس کے سارے کپڑے ہی سونے کے بن گئے۔ جب وہ جوتے پہننے لگا تو وہ بھی سونے کے بن گئے۔ اس کے کمرے کے دروازے، کھڑکیاں، پردے غرض سب ہی سونے کے بن گئے جب اس نے انہیں باری باری چھوا۔ یہاں تک کہ جو پرندہ پنجرے میں تھا، اس کی جادوئی طاقت نے اسے بھی نہ بخشا۔

جب وہ باغ میں گیا تو اس نے دیکھا کہ گلاب کے پھول پر شبنم جمی ہوئی تھی۔ مداس سے انہیں آہستہ سے چھوا یہ سوچتے ہوئے کہ سونے کے بن کر یہ اور بھی خوبصورت لگیں گے لیکن ان پھولوں کی خوشبو اور رنگ اڑ گیا، پر مداس کو یہ پھول پہلے سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوئے۔

اسی اثنا میں اسے بھوک محسوس ہوئی، وہ واپس محل کی طرف مڑا، راستے میں اس نے چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھائی اور لطف محسوس کرتا جب وہ سونے میں بدل جاتے۔ یہی سب کرتا ہوا وہ کھانے کی میز پر پہنچ گیا۔ ناشتہ دیکھنے میں بہت مزیدار، خوشبودار، اور تازہ لگ رہا تھا۔ تازہ ڈبل رٹی، مکھن، شہد، خوبصورت بوتل میں شربت یہ سب چیزیں مداس کی بھوک بڑھا رہی تھیں۔

مداس نے خوشی خوشی پانی کا گلاس اٹھایا لیکن وہ اس کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے سونے کا بن چکا تھا۔ یہی حال شربت کا بھی ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بغیر کھائے پیئے زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکے گا وہ زیادہ اور زیادہ دکھی ہوتا گیا۔ اس کی اداسی میں اس وقت زیادہ اضافہ ہوا جب اس کی عزیز بیٹی روتی ہوئی اس کے پاس آئی اس کے ہاتھ سونے کا پھول تھا۔

"دیکھیں" وہ سسکی۔ "کسی منحوس چیز نے میرے ان پھولوں کو سونے کا بنا دیا ہے، ان کا رنگ مدھم ہو کے سونے کا بن گیا ہے۔ اور ان کی خوبصورت خوشبو کہیں کھو گئی ہے۔"

"لیکن یہ تو سونے کے ہیں۔" مداس چلایا۔ "یہ کبھی بھی نہیں مرجھائیں گے۔ یہ ہزاروں پھولوں سے زیادہ قیمتی اور خوبصورت ہے۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں!" اس کی بیٹی نے اپنا دایاں پاؤں زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس سے نفرت ہے۔" اس نے اس پھول کو زور سے زمین پر پٹخا اور اپنے باپ کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ مداس نے جب اپنی بیٹی کی رونے کی آواز سنی تو اس سے رہا نہ رگیا اور اس نے اپنا بازو اپنی بیٹی کے گرد لپیٹ لیا تاکہ اسے تسلی دے سکے۔ تب ایک خوفناک بات ہوئی، اس کی

بیٹی کا نرم اور چھوٹا سا جسم سخت اور ٹھنڈا ہو گیا۔

اپنی عزیز بیٹی کی جگہ اب ایک سونے کا مجسمہ اس کے گھٹنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ اس کے نوکر اسے تسلی دینے کے لئے اس کے نزدیک آئے لیکن اس نے سب کو اپنے سے دور کر دیا اور کہا کہ وہ چھوت ہے۔

"اب مطمئن ہو مداس۔" ایک آواز گونجی، مداس فوراً پہچان گیا یہ آواز بے قس کی تھی۔ اس نے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے اور فریاد کی کہ "مجھے بچاؤ میں پاگل تھا جو یہ خواہش کی۔"

"اب تو تمہارے پاس یہ طاقت ہے تم ہر چیز کو سونے میں بدل سکتے ہو کیا اب بھی مطمئن نہیں ہو؟" آواز پھر گونجی۔

"میں بھول گیا تھا کہ دنیا میں سونے سے بھی زیادہ قیمتی چیزیں ہیں۔" مداس افسردگی سے بولا۔ "میری پیاری سی بیٹی، وہ پھول جو میری بیٹی کو بہت پسند تھے۔ دوست! یہاں تک کہ ایک گلاس پانی۔" وہ زور زور سے رونے لگا۔

"تم نے سبق سیکھ لیا ہے۔" بے قس نے نرم آواز میں کہا۔ "میں تمہاری مدد کروں گا تم اپنے محل کے پیچھے بہنے والے دریا میں جاکر غسل کرو، اور پھر اسی دریا کے پانی کو ان چیزوں پر چھڑکوں جن کو تم نے سونے کا بنا دیا ہے۔"

مداس نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر دریا کی طرف دوڑ لگائی۔ دریا میں غسل کرنے کے بعد جب وہ دریا سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ اس کے

دانت کی چوری

۱۹۶۷ء میں جکارتہ (انڈونیشیا) میں چوری کی ایک عجیب واردات ہوئی۔ ہوا یوں کہ بس میں ایک مسافر سو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو پتہ چلا کہ سوتے میں کسی نے اس کا سونے کا دانت چرا لیا ہے۔ مرسلہ : مسعود احمد سومرو، گڈو

کپڑے دوبارہ اپنی اصلی رنگ میں آ گئے۔ حیرانی میں اس نے دریا کے کنارے اگے ہوئے پھول کو چھوا وہ سونے میں تبدیل نہیں ہوا۔ اس نے ایک بالٹی میں پانی بھرا اور اس جگہ پہنچا جہاں اس کی بیٹی سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے خوشی میں اتنا زیادہ پانی پھینکا کہ جب وہ اپنی اصلی حالت میں آئی تو اس نے کہا۔ "کیا آپ مجھے ڈبونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مداس اور اس کی بیٹی باغ میں گے اور ان پھولوں پر جو سونے کے بن چکے تھے، پانی چھڑکا تو یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے کہ وہ واپس اپنی اصلی حالت میں آ گئے تھے۔

سچ ہے لالچ بری بلا ہے، مداس نے اب لالچ سے توبہ کر لی اور اپنے خزانوں کے منہ لوگوں کی بھلائی کے لئے کھول دیئے۔ لیکن اس کی بیٹی کے بال سنہرے ہی رہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ سمندر کی ریت میں سونے کا عکس اسی واقعہ کے بعد چلا آ رہا ہے۔

اخبار آنکھ مچولی

لعل بخش، کراچی

دلچسپ خبروں پر مشتمل آنکھ مچولی کا مستقل سلسلہ

چائے کا دھتی..... اصغر مہدی

شہر کراچی میں اکثریت چائے بڑے شوق سے پیتی ہے اور دفاتر میں تو اس کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ بزرگ جب صبر کے لئے کہتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں کہ صبر کے گھونٹ پیو لیکن یہاں صبر کرنے والے اور بے صبرے دونوں ہی چائے پیتے ہیں۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتے چلیں کہ ایران کے اخبار "کیہان انٹرنیشنل" کے مطابق ایران کے شہر "تبریز" کا رہنے والا ایک شخص اصغر مہدی روزانہ چائے کے دوسو کپ پیتا ہے۔ اصغر مہدی کا کہنا ہے کہ "چائے پینے میں کوئی شخص اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

سر دیکھتے ہی سر قلم کرادیا

گنجا ہونا کوئی جرم تو نہیں لیکن کسی گنجے کو گنجا کہنا یقیناً" بُری بات ہے عام گنجے تو بُرا نہیں مانتے لیکن فرانس کے گنجے بادشاہ سرہنری چہارد ہم کو ایک بار یہ بات سخت ناگوار گزری۔ وہ دو مختلف قسم کی وِگ استعمال کرتا تھا۔ شاہی حجام کے سوا کسی کو اس کا گنجا سر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ رات کو سونے کے لئے وہ ایسی مسہری استعمال کرتا تھا جس کے چاروں طرف دہرے پردے لگے ہوئے تھے۔ سونے سے پہلے وہ وگ اُتار کر خادم کے حوالے کردیتا۔ صبح وہی وِگ اسے اس طرح واپس کی جاتی کہ خادم کو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آئے۔ ایک بار خادم نے وِگ دیتے وقت پردے کو ضرورت سے ذرا زیادہ ہی سرکادیا اور بادشاہ کا گنجا سر دکھائی دینے لگا۔ ہنری چہارم نے خادم کو اس جُرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

محمد حسن عارف خان، **کراچی**- فروری کا خوبصورت شُمارہ ملا- حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسول مقبولؐ سیدھی دل میں اُتر گئیں- الطاف حسین کی تحریر "المکتہ المکرمہ" بہترین تھی- **میمونہ عارف**، **فاطمہ عارف**، **کراچی**- خوبصورت سرورق سے سجا شُمارہ ملا- کہانیوں میں "بیٹا" "وہ کون تھا" "راج گڑھ کی حویلی" اور "وہ عید کب آئے گی" بے حد پسند آئیں- ہماری طرف سے آپ کو ڈھیروں عید مبارک باد! ○ ....جزاک اللہ! آپ کو بھی عید مبارک! **جمیل بشیر احمد سانبھری**، **حیدر آباد**- فروری کا شمارہ بہت پسند آیا- "ک سے کرسی" "آخری کھلاڑی" "المکتہ المکرمہ" "اوپن دی ڈور" اور "بیٹا" اچھی تحریریں تھیں- نظم "عید اب کے برس بھی آتی ہے چُپکے چُپکے" بے حد پسند آئی- **سیّد فرحان احمد**، **حیدر آباد**- جب میں حیدر آباد سے خط روانہ کرتا ہوں تو میرے خط کے ساتھ کراچی شہر کا نام کیوں لکھ دیا جاتا ہے- سبب جاننے کے لئے بے تاب ہوں، جواب سے نوازیے گا!! ○ .... آپ کے ایک ہم نام کراچی میں بھی رہتے ہیں- **وسیم احمد صدیقی**، **کراچی**- فروری کا آنکھ مچولی ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوا خاص کر ٹائیٹل اور اندر کے رنگ برنگ صفحات

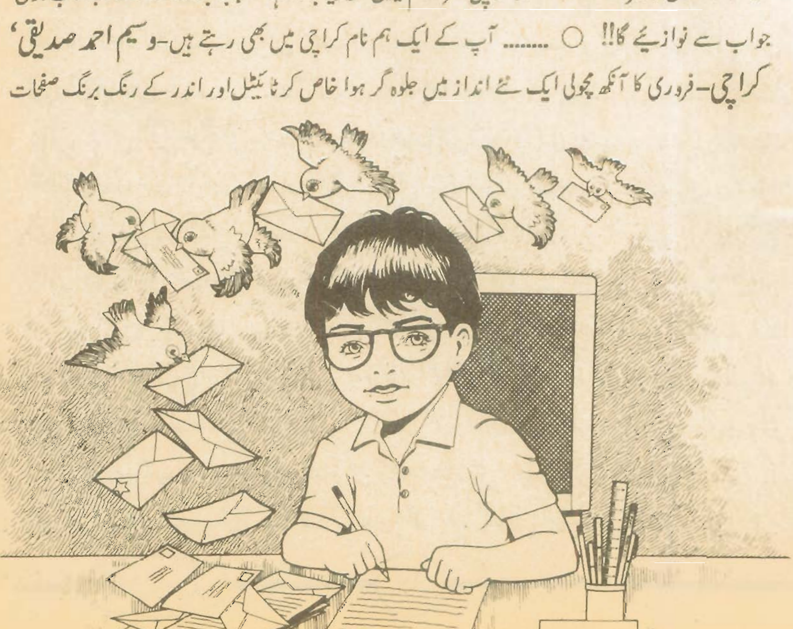

بہت اچھے تھے- رنگ برنگ ابو قرن پر معلومات بے حد پسند آئیں- ہم نے اس پرندے کو کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے- مضامین میں "اپنی مٹی کا خیال" "علم طب کا امام" "المکتبہ المکرمہ" اور "ک سے کرسی" دلچسپ اور معلوماتی تھے- "کہانیوں میں راج گڑھ کی حویلی" "وہ عید کب آئے گی" "آخری کھلاڑی" "بیٹا" اور "اوپن دی ڈور" بے حد پسند آئیں- "روزوں میں ہے رحمت رب کی" "عید اب کے برس بھی آتی ہے چپکے چپکے" اور "اللہ ہے بس پیار ہی پیار" بے حد زبردست نظمیں تھیں- "اللہ ہے بس پیار ہی پیار" ٹی وی پر آتی ہے اور گھر میں ہم سب بہن بھائیوں اور اسکول میں ہمارے سب دوستوں کو بے حد اچھی لگتی ہے- آپ نے اسے شائع کر کے ہم سب کا دل خوش کردیا ہے- اللہ آپ کا دل بھی خوش کرے- ○ ...... شکریہ-**صبا شیرازی، لاہور**-سرورق بہت اچھا تھا- نظمیں بے حد پسند آئیں-**شاہ رخ ظہور، کراچی**-میں آنکھ مچولی کا سالانہ خریدار کس طرح بن سکتا ہوں؟ ○ ...... سالانہ خریداری کا اشتہار پڑھ لیجئے اور جلدی سے......**محمد معظم اعزاز، ملتان شہر**-رسالہ پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا لیکن اس میں انعامی سلسلے کچھ جاندار نہیں ہیں- ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے-**ملیحہ عبدالمتین، کراچی**-فروری کا شمارہ انتہائی شاندار ہے اور ماہِ رمضان کی مناسبت سے بہت جلد ملا- شمارہ بے حد حسین منظر پیش کررہا ہے- آئندہ شمارے بھی اتنے ہی شاندار چھاپیے کہ پڑھ کر مزا آجائے-**شیخ علی رضا قمر، چوکی**-خوبصورت سرورق کے ساتھ آنکھ مچولی ملا- سائنسی مضامین بہت پسند آئے-**ارمعہ جعفر، ڈیرہ اسماعیل خان**-سرورق بہت ہی اچھا لگا- سارا رسالہ لاجواب ہے- رنگین صفحات دلچسپ ہونے کے ساتھ مزے دار بھی تھے-**محمد افضل خان، ڈیرہ غازی خان**-ایک دوست سے آنکھ مچولی لے کر پڑھا بہت اچھا لگا- اب میں اس کا سالانہ خریدار بن رہا ہوں-**دھنی بخش مہر، پسنی**-بہت عرصے بعد خط لکھ رہا ہوں مجھے آنکھ مچولی بے حد پسند ہے- میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی روز و شب ترقی کرے-**سدرہ اقبال، کراچی**-آنکھ مچولی کی قیمت یوں تو زیادہ ہے لیکن اس کا معیار دیکھ کر ہم اسے پڑھنے لگے ہیں- معیار کو برقرار رکھیئے گا کہ معیار کو قائم رکھنا ہی حُسن ہے-**شیر نواز گل، پشاور**-جناب! کوئی مشورہ دیجئے کہ میں بھی اچھا ادیب بن جاؤں! ○ ...... اچھی کتابوں کا مطالعہ، مشق، توجہ اور لگن یہ چیزیں آپ کو اچھا ادیب بنا سکتی ہیں-**حسین علی آرائیں، حضرو**-پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل میں آنکھ مچولی بچوں کا پسندیدہ ماہنامہ ہے-**شاکر اعوان، کراچی**-آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے- میری کہانی وطن کے غدّار آپ کو کیسی لگی؟ ○ ...... بھئی اعوان! اس نے تو غداری کی اور ردّی کی ٹوکری سے مل گئی ہے- آپ کوئی اور اچھی سی وفادار تحریر بھیجئے-**معیار علی معیار، پسنی**-آنکھ مچولی مجھے بے حد پسند ہے- میں اس کا ہر مہینے بے چینی سے انتظار کرتا ہوں-**محمد سعید، بہاول نگر**-"بہروپیا" بھیج رہا ہوں- ضرور

ضرور شائع کیجئے۔ ○ ...... آپ کی تحریر کا روپ تو رَدّی کی ٹوکری کو پسند آگیا اب آپ ہماری پسند کی کوئی مختصر اور دلچسپ سی تحریر روانہ کیجئے۔ **سمیرا اقبال، کراچی**۔ آنکھ مچولی دیر سے ملا لیکن دلچسپ تھا۔ کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ **پرنس افضل شاہین، بہاول نگر**۔ شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ کہانیاں اور مضامین پسند آئے۔ آپ نے میرے نام کو تین مہینوں سے بلیک لسٹ کیوں کیا ہوا ہے؟ ○ .....اس خط کی اشاعت کے بعد آپ کو ہم سے شکایت نہیں ہوگی۔ **محمد عارف، پسنی**۔ تازہ شمارہ پڑھا، بے حد پسند آیا۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ لطائف اور نظمیں بھی بہت پسند آئے۔ **طاؤد بلوچ، پسنی**۔ آنکھ مچولی کی تمام کہانیاں اور نظمیں دلچسپ تھیں۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں، شامل فرمائیں **فیصل رضا، سکھر**۔ شمارہ بہت پسند آیا۔ قلم دوست کی تحریریں لاجواب تھیں۔ **عارفہ شارق، کراچی**۔ ماہِ رواں کی پہلی بات بہت اچھی لگی۔ سرورق زبردست تھا، تحریریں پسند آئیں۔ **آمنہ سلطان، پشاور**۔ شمارہ بہت پسند آیا۔ آنکھ مچولی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ **ہُمانصیر، کراچی**۔ آنکھ مچولی خوب تھا۔ سرورق پسند آیا۔ تمام کہانیاں نہایت مزے دار تھیں۔ **فاطمہ تراب علی، حیدر آباد**۔ سرورق اور تحفہ دونوں بہت پسند آئے۔ **محمد عارف گوجرہ**۔ تمام ہی تحریریں اچھی تھیں کس کو نمبرون کہوں۔ **غزالہ بشیر، بہاول نگر**۔ اس ماہ کا سرورق بہت ہی اچھا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بچے جانوروں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ **قرۃ العین، راولپنڈی کینٹ**۔ رسالہ تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں بہت اچھی تھیں۔ میں راحت صلاح الدین سے دوستی کرنا چاہتی ہوں کیا آپ ان کا پتا عنایت فرمائیں گے۔ ○ ....بھئی بینی! آپ راحت کو آنکھ مچولی کی معرفت خط لکھ سکتی ہیں۔ آپ کا خط ان تک پہنچا دیا جائے گا۔ **ماجد لطیف، لاہور کینٹ**۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ **فہد آفتاب، کراچی**۔ آنکھ مچولی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ **راشد منیر، مظفر گڑھ**۔ ذہنی آزمائش سے متعلق کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں امید ہے پسند آئیں گی۔ ○ ..... راشد! ذہنی آزمائش کا ایک نیا سلسلہ ادارہ عنقریب شروع کرنے والا ہے۔ **میر عدیل پرویز، مظفر آباد**۔ سرورق بہت خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ **مجیب الرحمٰن لغاری، ٹنڈو محمد خان**۔ سندھی صفحات آپ نے کیوں بند کردیئے؟ ○ ...... ہمارے سندھی بھائی بہن اس میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہے تھے پھر نقصان کی وجہ سے یہ صفحات بند کرنے پڑے۔ **احمر فرقان، ملتان**۔ کیا آپ ذہانت کا کوئی نیا سلسلہ شروع کریں گے؟ ○ .... انشاء اللہ ..... عنقریب! **ثمینہ شمس، نیو کراچی**۔ مجھے آنکھ مچولی میں چھپنے والی قسط وار کہانی "وہ کیا راز تھا" بہت پسند آئی تھی کیا آپ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے؟ ○ .... آپ کی یہ خواہش بہت جلد پوری کی جائے گی۔ **محمد فاروق منیر، لاہور**۔ آنکھ مچولی سب سے مہنگا رسالہ ہے۔ حکومت نے کاغذ پر ڈیوٹی کم

کردی ہے اب آپ کو بھی رسالے کی قیمت پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ ○ ..... حکومت نے تو ابھی اعلان کیا ہے بہرحال ہمیں آپ لوگوں کی تکلیف کا احساس ہے ہم اس پر غور کررہے ہیں۔

فوزیہ یوسف' حافظ آباد۔ ٹائٹل پر خوبصورت باغ و بہار منظر دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ماہ رمضان کے حوالے سے خصوصی تحریریں ایمان افروز تھیں خاص کر "اپنی مٹی کا خیال" میں انداز بیاں بہت خوبصورت اور پرکشش تھا۔ کرکٹ کے حوالے سے تحریریں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ عید کے حوالے سے "وہ عید کب آئے گی" معاشرے کے دکھ اور کرب کی صحیح عکاس تھی۔ نظمیں اور نعت پسند آئی۔ نئے سلسلوں کی آمد خوش کن ہے۔ **گہرام حیات' تربت (مکران)۔** جنوری کے شمارے میں میرے دوست حق عزیز کا نام چھپا تھا۔ مگر انعام نہیں ملا۔ ○ ..... ان کا انعام انہیں عنقریب روانہ کردیا جائے گا۔ **محمد عدیل دانش' کراچی۔** شمارہ دیر سے ملا لیکن سرورق کے کیا کہنے۔ تمام تحریریں اپنی مثال آپ تھیں خاص کر ورلڈ کپ کے حوالے سے تمام تحریریں اچھی تھیں۔ عمر احمد خان کی "آخری کھلاڑی" اور "وہ عید کب آئے گی؟" بہت پسند آئی۔ "علم طب کا امام" معلومات سے بھرپور تحریر تھی جبکہ نظموں میں "درخت" پسند آئی۔ **عدیل اسلم' گجرانوالہ۔** اس بار ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ ایسے رنگ برنگ ٹائٹل ہی آنکھ مچولی میں اچھے لگتے ہیں۔ **محمد رحمت اللہ' گجرات۔** فروری کا شمارہ پسند آیا۔ مگر "اب میں کیا کروں؟" کا سلسلہ کہاں گیا؟ ○ .... چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر اب آپ اپریل کے شمارے میں اسے ملاحظہ کرسکیں گے۔ **طارق اسماعیل صابر' کھلابٹ ٹاؤن شپ۔** فروری کا آنکھ مچولی جھٹ سے خریدا اور پٹ سے پڑھ ڈالا۔ سب سے پہلے "موت کی آواز" سے دو دو ہاتھ کئے۔ کہانی بہت مزیدار ہے پر اس کے صفحات بہت کم ہیں۔ "محاورہ کہانی" اور "راج گڑھ کی حویلی" دونوں بہت ہی زبردست تھیں جبکہ "آخری کھلاڑی" اور "پاکستان جیت گیا" نے آنکھ مچولی میں چار چاند لگادیئے۔ **سعدیہ رضا' چیچہ وطنی۔** اس ماہ کا آنکھ مچولی دلکش ٹائٹل کے ساتھ ملا دل خوش ہوگیا۔ "ریہرسل" "قلم دوست" اور "راج گڑھ کی حویلی" بہت پسند آئیں۔ **محمد اویس یوسف زئی' اٹک۔** شمارہ لیٹ ملا' تحفہ بہت پسند آیا۔ **ناصر محمود' گاؤں فورمل (اٹک)۔** رسالے کا ٹائٹل بہت خوبصورت لگا۔ اس طرح کے خوبصورت ٹائیٹل چھاپا کریں۔ **جاوید اقبال اویس' تحصیل پپلاں۔** شمارہ بہت پسند آیا۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ **کمال احمد حازم' حیدر آباد۔** آپ میری تحریریں ناقابل اشاعت میں چھاپ دیتے ہیں آپ ایڈیٹر حضرات پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں! ○ .... اچھے بھائی کمال! آنکھ مچولی میں معیاری تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ آپ معیاری اور دلچسپ لکھنے کی کوشش کیجئے تو آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابلِ اشاعت
تحریروں کا کالم

"گل بکاؤلی" صفیہ سلطانہ، کراچی۔ "بردہ فروش" ناصر محمود، ہاروں آباد۔ "بیٹے ہمارے تمہارے" "کدوؤں کی کمی نہیں غالب" ہدایت شاہ، کنریاں۔ "عجیب مستقبل" منصور احمد مگسی، جیکب آباد۔ "کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں" تیمیہ صبیحہ، لاہور۔ "عقل مند کبوتر" محمد مطہر سعید، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "رحم دل آنکھ" ذلیخان سولنگی، گڈو۔ "سیر سوا سیر" محمد ذیشان، جھنگ۔ "سگریٹ نوشی کا انجام" یاسمین خان، لاہور۔ "تندرست بچے کی فریاد" ذلیخان سولنگی، گڈو۔ "بہت دیر کردی" ساجد شفیع، کراچی۔ "یہ دیس" افشاں غوری، حیدر آباد۔ "ضمیر کو بیچ دیتے ہیں" "انٹرویو" نثار احمد، پنجگور۔ "جل رہی ہے کشمیر کی وادی" زاہد حسین ابڑو، عمر کوٹ۔ "عقلمند خرگوش" صائمہ اکرم، رحیم یار خان۔ "اے میرے کشمیر" حسنین عباس، جھنگ۔ "بڑھیا کی ناشکری" محمد آصف معروف، بہاولپور۔ "پولیس کی کامیابی" محمد ثاقب (؟) "اہم کامیابی" محمد معظم بابرہ، بہاولپور۔ "کالا گلاب اور پری" مریم طاہر، مانچسٹر (امریکہ)۔ "چغل خور" "اب ہم یہ کریں گے" "ہوا یوں کہ" ارم ہدایت، چشمہ بیراج۔ "نعمت" افشاں ریاض، بہاولپور۔ "خود غرض دیو" ملک محمد نعمان، راولپنڈی۔ "ہم اور بھوت" رحمت اللہ بشیر، "جنم جنم" محمد حسین شاہ، پشاور۔ "ماں" حسرت صدیقی، لورالائی۔ "ہم ہیں پاکستانی بچے" برکت اللہ بلوچ، گوادر۔ "سنی کو دادا مل گئے" ارم بتول، چشمہ بیراج۔ "پاکستان زندہ باد" پرنس عرفان حسین، کراچی۔ "ایک عجیب و غریب واقعہ" جمیل بشیر احمد، حیدر آباد۔ "ہونہار بروا" امتیاز ارم اعوان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "ادرک کی روٹی کا آدمی" فوزیہ ودود، کراچی۔ "جب آزاد فضا ہوگی" مجاہد حسین زیدی، کراچی۔ "ریچھ کی دوستی" شازیہ اکرم، کراچی۔ "عالم کے پکوڑے" "میں انتظار......" ناصر حفیظ، ملتان۔ "چھ درہم میں دو چانٹے" ہما افتخار، کراچی۔ "بلیک میلر" امجد اسلام، ایبٹ آباد۔ "نافرمانی" راحیلہ بانو، پشاور۔ "سونے کی عادت" (؟)۔ "ایثار" عدیل ستار، کراچی۔ "عظیم قربانی (؟)۔ "ڈش انٹینا" عبدالرافع شیخ، شہداد کوٹ۔ "باریک بین" ذیشان احمد شان، قصور۔ "ایجادیں کیسے ہوئیں" علی رضا، کراچی۔ "امریکہ نہ جانا" بلال طارق، لاہور۔ "نانی اماں کہتی ہیں" فیصل انوار فیصل، کراچی۔ "جشن آزادی" نصرت شمشاد، کراچی۔ "سوال" مخدومہ بخاری، سیالکوٹ۔ "ہائے یہ شوق ہمارا" محمد عامر علی، کراچی۔ "اٹھنی مل گئی" صدف ملک، راولپنڈی کینٹ۔ "ہمارا کارنامہ" مدیحہ اختر، لاہور۔ "قدرت کے عجیب کھیل" محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔ "انعام" محمد اکبر رشید بھٹی، کہروڑپکا۔ "مہنگائی" محمد قادر، کراچی۔ "ککڑوں کوں" شاہینہ علی، لاہور۔ "قلفی والا آیا" شمائلہ خان، کراچی۔ "شرارتی لڑکا" محمد عبید خان، کراچی۔ "شہنشاہ ہند" سید خورشید علی، نواب شاہ۔

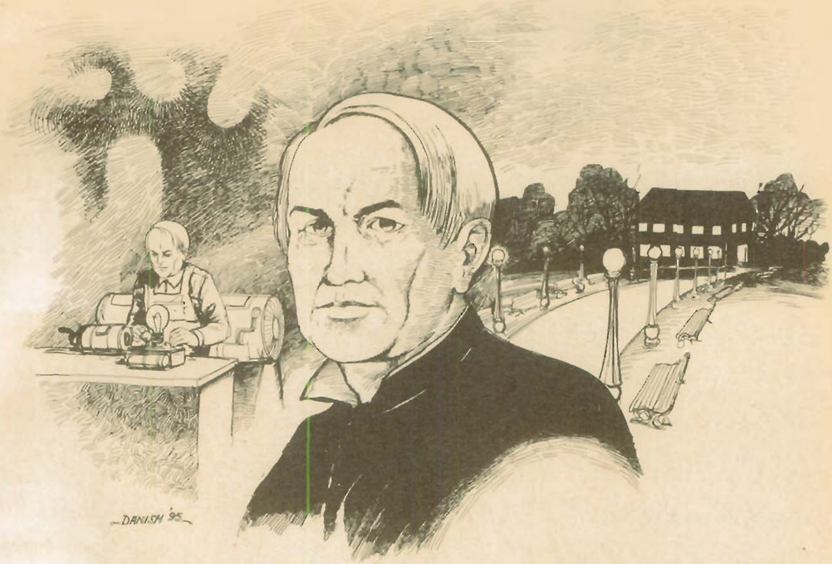

بلب کی ایجاد کی حیرت انگیز کہانی

عبدالستار خان طاہر

ٹامس ایلوا ایڈیسن کا شمار دنیا کے بہت بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے۔ وہ بلا کا ذہین تھا اور خاص طور پر ہر بات کی تہ تک پہنچ جانے کی خوبی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایڈیسن وہ خوش نصیب انسان ہے، جو بجلی کی روشنی دریافت کر کے اپنا نام روشن کر گیا۔ ایک دن وہ جب اپنی اس حیرت انگیز دریافت کے سلسلے میں کام کر رہا تھا تو اسے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ شیشے کے بے ڈول گول مٹول بلب کے اندرونی رقبے کی پیمائش کی جائے چونکہ وہ خود اپنے تجربے میں مصروف تھا، اس لئے اس نے ایک ایسے شخص کو اپنی مدد کے لئے بلایا جو اس کے ساتھ مل کر کام کرنے والے ماہر لوگوں میں سب سے عقلمند سمجھا جاتا تھا۔ یہ نوجوان حساب کا ماہر تھا۔ ایڈیسن کی درخواست پر وہ اپنے سامنے صاف کاغذوں کا ڈھیر لگا کر بلب کی اندرونی پیمائش کے کام میں لگ گیا۔ پورے ایک ہفتے کے بعد ایڈیسن نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں اپنے کام میں کچھ کامیابی ہوئی؟" اس نے جواب

دیا "جی ہاں! لیکن ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا۔"
ایڈیسن نے ان بے شمار کاغذوں کو دیکھا جن پر کھنچے ہوئے خاکوں اور ہندسوں کے ذریعے اس کا ذہین ساتھی سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور پھر اس سے پوچھا "کتنے دن اور لگیں گے؟"
"صرف ایک ہفتہ اور مسٹر ایڈیسن۔" "لیکن یہ تو صرف ایک منٹ کا کام تھا۔" ایڈیسن نے کہا "آؤ میں تمہیں ابھی کر کے بتاتا ہوں۔"
ایڈیسن نے بلب کو پانی سے بھرنے کے بعد اپنے ساتھی سے کہا۔ "اب اس پانی کو ناپنے والے گلاس میں ڈالو اور اس طرح تمہیں اپنے سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔"

مختلف چیزیں ایجاد کرنے کے بعد اب ایڈیسن کافی زیادہ شہرت حاصل کر چکا تھا اور اس وقت تک وہ "مینلو پارک نیوجرسی" کے مقام پر اپنا ایک کارخانہ بھی تعمیر کر چکا تھا۔ وہاں وہ دن رات اپنے تجربات میں مصروف رہتا تھا۔ انہی تجربات کے دوران ایک دن ایڈیسن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ "رات کو دن میں کیسے بدلا جائے؟ انسان ہزاروں برس سے سورج غروب ہو جانے کے بعد تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارتا چلا آیا تھا۔ روشنی حاصل کرنے کا سارا دارومدار چربی، مختلف تیلوں اور موم بتیوں کے استعمال پر تھا۔ پھر دنیا نے ترقی کی اور مٹی کے تیل اور گیس سے روشن ہونے والے چراغ بنا لئے گئے۔ لیکن ایڈیسن ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگا رہا۔ وہ سوچتا تھا کہ دنیا کو بجلی کی روشنی سے منور کیا جائے اس نے کہا۔ "اگر بجلی حرارت اور طاقت (POWER) پیدا کر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روشنی حاصل نہ کی جائے۔"

بجلی سے روشنی حاصل کرنے کے لئے ہمیں صرف ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو بجلی کی حرارت اور طاقت کے اثر سے ٹھیک طور پر جل سکے۔ جس طرح تیل کی رو سے روئی کی بتی جلتی ہے۔ اس طرز پر سوچنے والا اکیلا ایڈیسن ہی نہیں تھا۔ بعض دوسرے سائنس دان بھی اس قسم کی باتیں سوچ رہے تھے۔ ایڈیسن کی پیدائش سے چالیس برس بیشتر "ہمفری ڈیو" نامی انگریز سائنس دان نے پتھر کے کوئلے کے دو لمبے ٹکڑوں میں برقی رو گزار کر روشنی حاصل کی تھی۔ جیسے عام چراغ کی لو ہوا کے جھونکوں سے ایک طرف کو جھک جاتی ہے بالکل اسی طرح کوئلے کے ان دو ٹکڑوں کے درمیان برقی رو کمان کی طرح خم ہو جاتی تھی۔ اس وجہ سے ڈیو نے اپنے ایجاد کئے ہوئے چراغ کو "محرابی چراغ" کا نام دیا۔ دوسرے موجدوں نے ہمفری ڈیو کے خیال کو اپنا کر اس میں اور زیادہ ترقی کی۔ ۱۸۷۶ء میں "جابلو خوف" نام کے روسی سائنس دان نے ایک چراغ بنایا اور اس کا نام "برقی موم بتی" رکھا۔ لیکن یہ چراغ کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے چراغ کے طور پر کثرت سے استعمال نہ کیا جا سکا۔ کیونکہ وہ لمحہ بھر کے لئے جلتا اور پھر بھڑک کر بجھ جاتا تھا۔

"ولیم ویلیس اموسیس جی فارمر اور ڈبلیو۔ ای۔ سویئر" کے علاوہ اور بہت سے امریکی سائنس دانوں نے اپنے اپنے طور پر بجلی سے جلنے والے محرابی چراغ بنائے۔ لیکن یہ سب کے سب ناکام ثابت ہوئے۔ سائنس دان ایسی کوئی شے تلاش نہ کر سکے جو اتنی مضبوط ہوتی کہ بجلی کی حرارت اور قوت برداشت کر کے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک بتی کی طرح جلتی رہتی۔ ایڈیسن نے اس مشکل کو آسان کیا۔ یہ ساری کہانی انسانی ذہن کے کمالات کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جب اس نے اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لئے پہلے پہل کام شروع کیا تو ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ ایڈیسن اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ "نیو یارک" کے ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے اداریئے میں لکھا۔ "یہ بات کسی قسم کے شک کے بغیر تسلیم کی جا چکی ہے کہ بجلی سے روشنی حاصل کرنا قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ ایسی روشنی قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔" لیکن ایڈیسن کے نزدیک "ناممکن" کا مطلب "عین ممکن" تھا۔ بشرطیکہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کے ساتھ کام کرے۔" وہ محنت کرنے کے لئے میدان میں آیا۔ اس نے اپنے ساتھ مل کر کام کرنے والے ایسے لوگوں کا گروہ تیار کیا جنہیں "شب بیدار گروہ" کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ یہ لوگ کئی کئی راتوں تک اپنی نیند قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایڈیسن کو جب کبھی راتوں رات کسی خاص

قسم کے کام کو پورا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے کارکنوں نے اسے راتوں رات مکمل کر دکھایا۔ یہ ایڈیسن کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بہرہ تھا۔ لوگ اسے کئی الٹے سیدھے ناموں سے پکارتے۔ "وہ خواب دیکھتا ہے۔" "مغرور ہے" "پاگل ہے۔" لیکن ایڈیسن ان کے کسی طعنے کو سن نہ سکتا تھا۔" اس "خواب دیکھنے والے بیوقوف" نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ روشنی کے علم اور تاریخ پر اسے جس قدر کتابیں، مضامین اور مقالے مل سکے سب کے سب پڑھ ڈالے اس مطالعے کے دوران اسے جتنی باتیں اور تصویریں کام کی نظر آئیں انہیں یاداشت کے طور پر الگ لکھ لیا۔ اس طرح اس نے جو کاغذ کالے کئے ان کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ روشنی اور حرارت کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں۔ لیکن یہ ایسی باتیں تھیں جو غاروں میں زندگی گزارنے والے، پرانے زمانے کے لوگوں کو بھی معلوم تھیں۔ وہ بھی جانتے تھے کہ دو پتلی پتلی چھڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کر نہ صرف گرم کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر انہیں ذرا زیادہ زور سے رگڑا جائے تو وہ جل اٹھتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بعض چیزیں دوسری چیزوں کی نسبت زیادہ دیر تک جلتی ہیں اور ان سے نکلنے والی روشنی تیز ہوتی ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ایڈیسن کوئی ایسی شے معلوم کرے جو تیز سے تیز روشنی بھی دے اور ساتھ ہی

بجلی کی اس زبردست حرارت کو بھی برداشت کرے جس میں عام قسم کی چیزیں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ سب سے پہلے اس نے چند نایاب قسم کی دھاتیں پسند کیں۔ انہیں پگھلایا اور ان سے تار بنائے۔ لیکن اس میں سے کسی دھات کا تار یا دھاگہ فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ یہ باریک تار بجلی کی حرارت میں فوراً پگھل جاتے تھے۔ لیکن ایڈیسن مایوس نہ ہوا۔ اس کا کام برابر جاری رہا۔ وہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں اپنی تجربہ گاہ میں بیٹھا تجربے کرتا رہا۔ ایک کے بعد دوسری دھات کو آزماتا رہا۔ ایک دن اسے اچانک یہ خیال آیا کہ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تار کے ان باریک دھاگوں کو کسی ایسے لیمپ یا بلب (Bulb) میں جلائے جس کے اندر سے ہوا خارج کی جا چکی ہو؟" اس خیال کے آتے ہی اس نے ایک شیشہ ساز سے کہا۔ "میرے لئے سیب کی شکل کے بلب بناؤ۔" اور جب وہ بلب تیار ہو گئے تو ایڈیسن نے ویکیوم پمپ (Vacuum Pump) کے ذریعے ان کے اندر کی ہوا باہر کھینچ کر انہیں بالکل خالی کر لیا۔ جب تار کا دھاگہ اس بلب کے اندر جلایا گیا تو اس تجربے کا نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ جب بلب کے اندر آکسیجن باقی نہ رہی تو تار کے دھاگے جو بجلی کے اثر سے "برقائے" جا چکے تھے۔ نہ صرف تیز روشنی پیدا کرنے لگے بلکہ پہلے سے زیادہ دیر تک جلتے رہے۔ اب ایڈیسن نے بجلی سے روشنی کرنے کا سب سے اہم اصول۔ ویکیوم بلب (Vacuum Bulb) معلوم کر لیا تھا۔ (جس کے اندر سے ہوا خارج کی جا چکی ہو اسے "ویکیوم بلب" کہتے ہیں) لیکن وہ ابھی تک مطمئن نہ تھا۔ اگرچہ اس نے بلب میں نمایاں اصلاح کر لی تھی۔ پھر بھی اس کے اندر تار لمحہ بھر کے لئے روشن ہوتا اور اس کے فوراً بعد بجلی کی زبردست حرارت سے جل جاتا۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ایڈیسن ایسی کوئی دھات معلوم نہیں کر سکا، جس کے تار بلب میں کامیابی سے روشنی پیدا کر سکیں۔ بلب کے اندر تار کے ان باریک دھاگوں کو فلامنٹ [FILAMENT] کہتے ہیں۔ ایڈیسن سوچنے لگا کہ دنیا میں کوئی ایسی شے ضرور ہوگی جو بجلی کی زبردست حرارت کو برداشت کر سکے۔ لیکن کہاں؟ اور اسے کس طرح معلوم کیا جائے؟ اسے یہ معلوم نہ تھا۔ ایڈیسن کے نزدیک یہ بات جنگ کے اعلان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس نے ایک بہادر سپہ سالار کی طرح اس اعلان جنگ کو قبول کر لیا۔ اس نے اپنے ساتھ مل کر کام کرنے والے کاریگروں کا ایک سکاؤٹ بنایا اور یہ کام ان کے ذمے لگایا کہ فطرت کے سینے سے تیز روشنی پیدا کرنے اور زیادہ دیر تک روشن رہنے والے "فلامنٹ" کا راز حاصل کیا جائے۔ سب سے پہلے ان چیزوں پر تجربے شروع ہوئے جو "مینلو پارک" کے آس پاس مل سکتی تھیں۔ ان میں درختوں کی چھال، خاص قسم کا باریک چکنا کاغذ۔ پھونس۔ گتہ مچھلی پکڑنے والی ڈوریاں، پٹ سن، ربڑ اور کاک وغیرہ شامل تھے۔ اور تو اور ان

لوگوں نے اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو بھی تجربے کی کسوٹی پر پرکھا۔ کاریگروں کے اس گروہ میں ایک شخص کی داڑھی کے بال سیاہ اور گھنگھریالے تھے اور دوسرے کے سرخ، کالے بالوں نے اور سب چیزوں کی نسبت بجلی کی حرارت زیادہ دیر تک برداشت کی، لیکن اس محنت کے باوجود کوئی ایسی چیز دریافت نہ کر سکے جس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ کالے بالوں کے تجربے کی کامیابی دیکھ کر ایڈیسن اور اس کے کارکنوں نے مٹی کے تیل سے جلنے والے چراغوں کی چمنیوں سے کالک اکٹھی کی اور اسے کئی قسم کے دھاگوں پر مل کر تجربہ کیا، اس کالے رنگ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عام دھاگے کسی قدر مضبوط ہو گئے اور ان سے تیز روشنی نکلنے لگی۔ لیکن ان تجربوں سے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ایک بلب پورے چالیس گھنٹے تک جلتا رہا۔ لیکن ایڈیسن اس سے بھی مطمئن نہ ہوا۔ بجلی کی روشنی پر تجربے کرتے کرتے، ایڈیسن کو پورا ڈیڑھ برس گزر چکا تھا اور لگاتار تیز روشنی کے سامنے کام کرنے کی وجہ اس کی آنکھیں خراب ہو گئیں۔ لیکن اس نے اپنی تکلیف کا حال نہ تو اپنے ساتھ کام کرنے والے لوگوں پر ظاہر ہونے دیا اور نہ اپنی بیوی سے ذکر کیا۔ البتہ اس نے اپنے روزنامچے میں لکھا تھا کہ "کل رات کے دس بجے سے چار بجے تک میری آنکھوں میں سخت درد ہوتا رہا جسے برداشت نہ کرتے ہوئے مارفین (ایک نشیلی دوا) کی خوراک کھا کر سو گیا۔ اب آنکھیں پہلے سے اچھی ہیں۔ لیکن میں نے کام کا ایک پورا دن ضائع کر دیا۔"

جیسے ہی اس کی آنکھیں کچھ ٹھیک ہوئیں وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور آخر کار دن رات محنت کے بعد وہ دنیا بھر کو اپنی کامیاب ایجاد دکھانے کے قابل ہو گیا۔ یہ ۱۸۷۶ء کے کرسمس کا آغاز تھا۔ موجد نے نیو یارک اور فلاڈ لفیا سے سینکڑوں مہمانوں کو مینلو پارک میں مدعو کیا تھا۔ رات کے وقت مہمانوں کی گاڑیاں اسٹیشن پر پہنچنے لگیں۔ پچھلے پہر تھوڑی سی برف باری ہوئی تھی۔ جب پہلی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو ایڈیسن نے اپنے ایک کاریگر کو بجلی کا بٹن دبانے کا اشارہ کیا۔ بٹن دباتے ہی رات کی تاریکی غائب ہو گئی اور برف کی چادر نے جن کھیتوں اور میدانوں کو ڈھانپ رکھا تھا وہ برقی روشنی کے سیلاب سے لاکھوں جگمگاتے ہوئے ہیروں میں بدل گئے۔ چھوٹے چھوٹے سورجوں کی طرح سینکڑوں چراغوں نے اس سڑک کو منور کر دیا جو اسٹیشن سے ایڈیسن کی تجربہ گاہ کو آتی تھی۔ جب مسحور مہمان تجربہ گاہ میں داخل ہوئے تو انہیں بہت سے کاریگر میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دکھائی دیئے۔ ایک مہمان نے پوچھا۔ "مسٹر ایڈیسن کہاں ہیں؟" اس کا خیال تھا کہ جس طرح وہ بن ٹھن کر دعوت میں شریک ہونے آئے ہیں۔ اسی طرح ایڈیسن نے بھی بہت اعلیٰ لباس پہن رکھا ہو گا۔ ایک اور مہمان نے جو ایڈیسن کو پہچانتا تھا کہا کہ "وہ ڈائنمو کے قریب کھڑے ہیں۔" موجد اس ڈائنمو کو دیکھ رہا تھا۔ جو مشینی طاقت کو برقی

روشنی میں بدل دیتا ہے۔ اس نے بھورے فلالین کی قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جس پہ گریس (GREASE) اور کھریا مٹی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کا کوٹ تیزاب سے جلا ہوا تھا۔ جس کے دو سوراخ دور سے نظر آتے تھے۔ ایڈیسن کو اچھے کپڑے پہننے کی فرصت نہ تھی۔ ڈائینمو کی دیکھ بھال سے فارغ ہوتے ہی وہ مہمانوں کے استقبال کے لئے بڑھا اور بجلی کی روشنی کی پوری کہانی سنا کر انہیں خوش کرنے لگا۔ ہر ایک شخص خاموشی اور غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے ایک ایک کر کے انہیں ساری مشینیں دکھائیں اور یہ مشینیں جو کام کرتی تھیں اس پر بھی روشنی ڈالی اور جن لوگوں نے مل کر اس کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹایا تھا ان کی بھی تعریف کرتا رہا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تجربہ گاہ میں چند ایک ایسے واقعات بھی ہوئے جن سے مہمانوں کو حیرت بھی ہوئی اور لطف بھی آیا۔ جن کمروں میں بڑی طاقت والے ڈائینمو کام کر رہے تھے ان کے دروازوں پر ایڈیسن نے "باہر رہیئے" کے بورڈ لگا دیئے تھے۔ لیکن جن مہمانوں نے ان ہدایات کی پابندی نہ کی انہیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کی گھڑیوں پر مقناطیس کا اثر ہو گیا ہے۔ جن کمروں میں قدم رکھنے کی ممانعت تھی ایک نوجوان خاتون ان کے اندر جاکر راستے سے بھٹک گئیں اور کچھ دیر کے بعد چیختی ہوئی باہر آئیں۔ اس کے سر کے بال جو اس نے بڑی محنت سے سنوارے تھے، اس کے سر پر اڑ رہے تھے۔ کیونکہ

جب وہ ایک طاقت ور جنریٹر (بجلی پیدا کرنے والی مشین) کے قریب گئی تو اس کے بالوں میں لگی ہوئی لوہے کی سوئیاں مقناطیس کی طرف کھنچ گئیں۔ ان دو ایک چھوٹے موٹے واقعات کے سوا ساری دعوت بڑی پر لطف رہی۔ ایڈیسن کے کئی دوستوں نے اسے مجبور کیا کہ اس نے بجلی کا لیمپ بنانے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے لیمپ کو بازار میں لے آئے۔ لیکن ایڈیسن ابھی اس کام کیلئے تیار نہ تھا اس نے جو فلامنٹ تیار کیا تھا وہ بہت کمزور تھا اور اسے کامیابی کے ساتھ استعمال نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسے اس سے کہیں زیادہ مضبوط شے کی تلاش تھی۔ ایک دن اپنی تجربہ گاہ میں اسے بانس کا بنا ہوا ایک پنکھا نظر آیا۔ اس نے پنکھا اٹھایا اور اسے توڑ کر بانس کی پتلی پتلی تیلیاں کاٹ لیں۔ ان تیلیوں پر وہی کالک لگائی اور پھر اسے اپنے بلب میں آراستہ کر دیا بانس کا یہ ریشہ باقی تمام چیزوں سے کہیں زیادہ عمدگی کے ساتھ جلا۔ شاید وہ آج تک اسی شے کی تلاش میں تھا؟ اب اس نے بانس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا اور اس مطالعے کے دوران اسے معلوم ہوا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں کم از کم بارہ سو قسم کے بانس پائے جاتے ہیں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے اسکاوٹ ساری دنیا کے دورے پر بھیجے تاکہ وہ ان میں سب سے عمدہ قسم کے بانس حاصل کریں۔ جس سے فلامنٹ تیار کیا جائے یہ ایک طویل، تھکا دینے والی اور بہت قیمتی تلاش تھی۔ اس کے

کارکنوں نے دنیا کے مختلف حصوں سے تقریباً چھ ہزار بانسوں کے نمونے بھیجے اور ایڈیسن نے تجربہ گاہ میں بیٹھ کر ایک کے بعد ایک، ان سب نمونوں کو عملی طور پر آزمایا ان میں اکثر اچھے اور بہت اچھے ثابت ہوئے اور پھر ایک دن اسے ایک اور نمونہ وصول ہوا جسے اس نے "بہت ہی اعلیٰ" تصور کیا۔ یہ بانس ایمزون کے جنگلوں میں پایا جاتا تھا اب اس بانس کی تلاش کے بعد ایڈیسن کا بلب بازار میں فروخت کیلئے بالکل تیار تھا۔ اس طرح اس عظیم سائنس دان کی محنت نے ہمیں بلب جیسا قیمتی اور نفیس تحفہ دیا جس سے تاریکی میں ڈوبی ہوئی یہ دنیا روشن ہو گئی۔ یہ عظیم سائنس دان ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اپنی بجلی کی روشنی کی ایجاد کی باون ویں سالگرہ سے صرف تین روز پہلے اس جہانِ فانی سے چل بسا۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لیئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا اندازِ بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیئے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیئے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

دوست

روشنی

سید محمد اسامہ، راولپنڈی

ایک بادشاہ بڑا ظالم تھا اور اپنے ظلم کے لئے اسی طرح بدنام تھا جیسے حاتم طائی اپنی سخاوت کے لئے مشہور ہے۔

اسی زمانے کی بات ہے، شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ بزرگ جو کہتے تھے تمام لوگ توجہ سے سنتے اور ان کی باتوں پر عمل کرتے۔

ایک بار لوگوں نے ان سے کہا "آپ جو دوسروں کو کہتے ہیں اس پر پہلے خود عمل کرتے ہیں، آپ کی باتوں میں بے حد اثر ہے۔ آپ اس ظالم بادشاہ کو آئینہ دکھائیں۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "سچی باتیں سچے آدمی ہی سنتے ہیں جو شخص سچی باتیں بھلا کر دشمنی پر اتر آیا ہو، اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اسے آئینہ دکھانا فضول ہے!!"

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

مجھ پر ہے ایک خاص عنایت حضورؐ کی
شام و سحر برستی ہے رحمت حضورؐ کی

ہے ساری کائنات بدولت حضورؐ کی
جس کو ہوئی نصیب زیارت حضورؐ کی

سارے ہی انبیا سے ہیں افضل مرے نبیؐ
بہتر ہے سب سے دیکھئے سُنت حضورؐ کی

ہے راہ مستقیم فقط اسوہ رسولؐ
کافی ہے سب کے واسطے سیرت حضورؐ کی

مجھ پر ہے ایک خاص عنایت حضورؐ کی
شام و سحر برستی ہے رحمت حضورؐ کی

جب قرارداد منظور ہوئی

رضوانہ کنول

پچپن سال گزر گئے۔ اس واقعے کو پچپن سال کا عرصہ گزر گیا لاہور کی بات ہے۔ ایک وسیع میدان میں قائداعظمؒ محمد علی جناحؒ کی صدارت میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ قائداعظمؒ کی تقریر کے بعد مولانا فضل حقؒ نے ایک اہم قرارداد پیش کی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ "برصغیر کے ان شمال اور شمالی مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندوستان سے الگ کر کے ایک آزاد خود مختار مسلم حکومت قائم کی جائے۔"

جس روز یہ قرارداد مسلم لیگ کے جلسے میں منظور ہوئی اس روز مارچ کی ۲۳ تاریخ تھی اور سن تھا ۱۹۴۰ء۔

اس قرار داد کے منظور ہوتے ہی تعصّب کے مارے ہندو لیڈروں اور ان کی قوم میں جیسے ایک بھونچال آگیا۔ ان کے اخبارات بھی چیخ پڑے۔ وہ مُسلمانوں کو کبھی غلامی کا طعنہ دیتے کبھی مُسلمان لیڈروں کے خلاف نا زیبا زبان استعمال کرتے۔ یہ بھی کہتے کہ اگر قائداعظمؒ ایک الگ ملک بنانے میں کامیاب ہو بھی ہوگئے تو وہ ایک کمزور ملک ہوگا اور کبھی ترقی نہ کرسکے گا۔

ہندو اخبارات اور ان کے لیڈروں کی تیز ترین بوچھاڑ کا جواب قائداعظمؒ نے انگلستان کے ایک رسالے میں ایک فکر انگیز مضمون لکھ کر دیا۔ آپ نے لکھا :

"مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ ان کے رہنے سہنے اور رسوم رواج کے طریقے بالکل الگ ہیں۔ مسلمان جس گائے کا گوشت کھاتے ہیں ہندو اس کی پُوجا کرتے ہیں، اس طرح وہ اکٹھا کس طرح رہ سکتے ہیں؟ لہٰذا ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے۔"

قائداعظمؒ کے اس حقیقت پسندانہ مضمون نے برطانوی اور ہندو سامراج کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قوم ہیں۔

"لڑاؤ اور حکومت کرو" انگریزوں نے جس سرزمین پر قبضہ کیا وہاں اس قول کو دہرایا اور عمل بھی کیا لیکن قائداعظمؒ کی مدبّرانہ اور بے باک قیادت نے انگریز ایوانوں کی بُنیادیں ہلادیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اب زیادہ دیر تک وہ برصغیر پر قابض رہ نہیں سکیں گے۔

قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان کردیا۔ قائدؒ کی ولولہ انگیز قیادت مسلمان لیڈروں کی انتھک کوششوں اور مسلمانوں کے عظیم تر اتحاد کی بدولت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ۲۷ ویں طاق رات مسلمانوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش ہونے والی قرار داد کا خواب پورا ہوگیا۔ پاک لوگوں کا وطن پوری شان سے دنیا کے نقشے پر اُبھرا اور سب کو پتا چل گیا کہ آزادی کی قرار داد سچی اور ایک حقیقت تھی۔

آج بھی اس مقام پر جہاں پاکستان کی آزادی کی یہ قرار داد منظور ہوئی ایک مینار بنایا گیا ہے۔ جو آزادی کے اس عظیم دن کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

خلیل جبران کا کہنا ہے

○ تعجب کی بات ہے کہ ہم نیند سے تو محبت کرتے ہیں لیکن موت سے ڈرتے ہیں حالانکہ اس میں بڑے خوش آئند خواب ہوتے ہیں۔

مشورہ مفت

ذکیہ زیدی، راولپنڈی

بال بڑی بے رحمی کی ساتھ "سو بال فی گھنٹہ" کی رفتار سے "دھڑا دھڑ پٹاپٹ" گر رہے تھے جس کی وجہ سے مابدولت کافی غمگین تھے۔

بالآخر سہیلی صاحبہ جو ماشاء اللہ سے "مشورہ مفت" دینے کا کام بخوبی انجام دیتی ہیں پریشان دیکھ کر گویا ہوئیں "بس اتنی سی بات پر ہلکان ہوئی جاتی ہو۔ ابھی اس کا حل بتاتی ہوں" اور وہیں کھڑے کھڑے ایک عدد نسخے سے نواز دیا۔ جو کچھ اس طرح سے تھا،

"ایک عدد انڈا لے کر اسے پھینٹ لو پھر اس میں کچھ پانی کی ملاوٹ کر دو (کیونکہ ملاوٹ کے بغیر ہمارا گزارہ ہی نہیں ہوتا) ایک چمچ شیمپو اور جیلاٹن بھی اس میں شامل کر لو اس آمیزے کو سر پر لگا کر اچھی طرح مالش کر لو۔ دو تین گھنٹوں کے بعد سر دھو لو۔ بس پھر دیکھنا بال گرنا بالکل بند ہو جائیں گے۔"

کالج سے واپسی پر جلدی سے آمیزہ تیار کیا اور امی سے دردمندانہ اپیل کی کہ اسے سر پر لگا دیں انھوں نے بڑی ناخوشگواری کے ساتھ اسے سر پر لگا کر مالش کر دی بس جی! اس کے بعد تو غضب ہو گیا کوئی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دے رہا تھا جہاں جاتی وہاں سے ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے۔ کوئی غلطی سے بھی میرے قریب آنے کو تیار نہ تھا انڈے کی اتنی گندی بو تھی کہ خود میری برداشت سے باہر تھی جس کی وجہ سے سر چکرانے لگا۔

اس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے فوراً سر دھونے کا فیصلہ کر لیا اگرچہ نسخہ کے مطابق کم از کم چار گھنٹوں کے بعد سر دھونا تھا۔ لیکن میں اس مصیبت کو زیادہ دیر برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی اور اس فیصلے کو جلدی سے عملی جامہ پہنایا۔

لیکن ابھی یہ مصیبت اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہ تھی کیونکہ باتھ روم میں (جہاں سر دھویا تھا) انڈے کی بہت ہی گندی بو پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے امی نے ایک بار پھر ڈانٹ سے نواز دیا چنانچہ میں نے باتھ روم کو دھویا کافی جدوجہد کے بعد بو ختم ہوئی اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔

اور ساتھیو! اس سانحے کے بعد تو آئندہ میں نے اس نسخے کا نام لینے سے بھی توبہ کر لی ویسے راز کی بات ہے، یہ نسخہ بالوں کے لئے ہے بڑا مفید آپ اسے آزما کر تو دیکھیں!

قسط نمبر ۴

وہ ڈائری جو گمنام جزیرے سے ملی تھی اس میں ایک کمانڈو کے حالات درج تھے۔ اس کمانڈو کے سینے میں ملکی سلامتی کا ایک اہم راز پوشیدہ تھا جسے دشمن حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ دشمن کی قید سے نکل بھاگا اور موت سے لڑتا ہوا اس جزیرہ پر پہنچ گیا جو نہایت پراسرار تھا۔ کمانڈو نے ڈائری میں اس جزیرہ کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ اس ٹولی کے لئے نہایت تشویش ناک تھا جو ایڈونچر کے شوق میں اس جزیرے تک آپہنچی تھی۔ طلحہ، شاہد، سراج اور نعمان اس مختصر ٹولی کے ارکان تھے اور اب کچھ پریشان تھے کیونکہ انہیں وہ راستہ نہیں مل رہا تھا جہاں انہوں نے اپنی کشتی چھوڑی تھی۔ **اب آگے پڑھیے!**

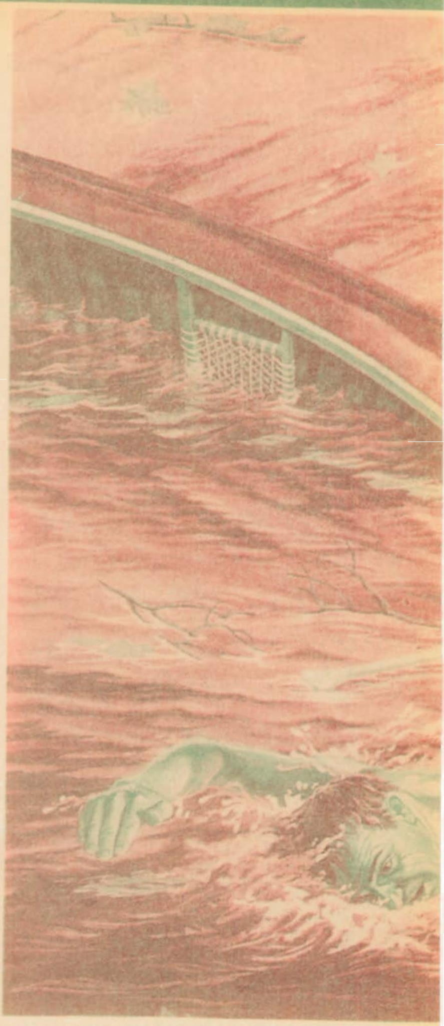

موت کی آواز

جام نذیر حسین

وہ لوگ تو چکرا کر ہی رہ گئے۔ "یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ ہماری کشتی کہاں چلی گئی؟" نعمان نے حیرت و پریشانی سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں ایک بار پھر کوشش کرتے ہیں۔" طلحہ نے ہمت دلائی اور پھر ان لوگوں نے سمندر کے کنارے کنارے گھوم پھر کر پورا چکر لگا ڈالا لیکن وہ راستہ کہیں نظر نہیں آیا جہاں انہوں نے اپنی کشتی چھوڑی تھی۔

"مجھے تو اب گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" سراج کا لہجہ پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لوگ ڈھائی تین گھنٹوں کی بھاگ دوڑ کے بعد خاصے تھک گئے تھے پھر اس فکر نے اور تھکا دیا تھا کہ واپس کس طرح جائیں گے۔

"کولمبس نے بھی اتنی بھاگ دوڑ نہیں کی ہوگی جتنی آج ہم نے کی ہے۔" شاہد ساحل کی ریت پر بھد سے گرتے ہوئے بولا۔ "کولمبس نے تو پھر بھی امریکہ دریافت کر لیا تھا ایک ہم ہیں کہ واپسی کا راستہ تلاش نہ کر سکے۔" سراج نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "واپسی کا راستہ بھی مل جائے گا اور جب ہم اپنی دنیا میں جائیں گے تو کولمبس کی طرح مشہور ہو چکے ہوں گے۔" نعمان نے گھبراہٹ کے باوجود لہجے میں شوخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اس جزیرے کو دریافت کرنے سے تو بہتر تھا کہ ہم امریکہ ہی دریافت کر لیتے۔" سراج نے جل کر کہا۔ "اس طرح یہ تو ہوتا کہ ہمیں کم از کم گرین کارڈ تو مل جاتا۔"

کچھ دیر تک چاروں دوستوں کے درمیان اسی طرح کی نوک جھونک ہوتی رہی پھر کچھ تھکن کم ہوئی تو انہوں نے جزیرے کی سیر کا فیصلہ کیا۔

جزیرہ خاصا بڑا تھا اور چاروں طرف سے ناریل کے درختوں اور سرسبز پودوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس جزیرے پر پرندے بھی اڑتے ہوئے نظر آئے۔ اور درختوں پر کودتے پھلانگتے بندر بھی مگر اس گہما گہمی کے باوجود ایک نامعلوم سی پراسرار فضا ماحول پر چھائی ہوئی تھی جو صاف طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

"اس جزیرے کی سیر کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کمانڈو کو بھی تلاش کرنا ہوگا جو اس جزیرے پر موجود ہے۔" طلحہ کی بات سنتے ہی سب کو اطمینان ہوا کہ اس پراسرار جزیرے پر ان کے علاوہ بھی ایک عدد انسان پہلے سے موجود ہے جو اس جزیرے سے متعلق کافی کچھ جانتا ہوگا۔

وہ لوگ کافی دیر تک جزیرے میں گھومتے رہے لیکن انہیں کمانڈو کہیں نظر نہ آیا اگرچہ انہوں نے کئی مواقع پر اسے پکارا بھی۔

"میرا تو خیال ہے وہ کمانڈو اس جزیرے پر ہی مر کھپ گیا ہے اگر ہوتا تو ہمیں نظر ضرور آتا۔" نعمان نے کہا۔ "اس کی ڈائری پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ اسے یہاں رہتے ہوئے کم

از کم ایک سال تو ہو گیا ہے۔" شاہد نے کہا۔
اب وہ لوگ تھک ہار کر ناریل کے ایک درخت کے سائے میں آبیٹھے۔ ان کے ہاتھ پر بندھی گھڑیاں دوپہر کے دو بجا رہی تھیں اور پھر وہ اتنا گھومے پھرے تھے کہ بھوک چمک اٹھی تھی حالانکہ صبح کا ناشتہ انہوں نے کشتی میں کیا تھا اور خاصی دیر سے کیا تھا۔ "بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے اب کیا کریں؟" سراج نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں لگ رہی ہے کیا ہمیں نہیں لگ رہی۔" نعمان اور شاہد نے سراج کو گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن کھائیں گے کیا۔ کھانے پینے کے لوازمات تو ہم نے کشتی میں ہی چھوڑ دیئے تھے۔" سراج نے کہا "تمہیں ہی بہت جلدی تھی جزیرے کی سیر کی۔ ہم نے سامان اتارنے کے لئے کہا تھا تو تم نے منع کر دیا تھا کہ بعد میں اتاریں گے پہلے جزیرے کا ایک چکر لگا لیں۔" شاہد اور نعمان ایک ساتھ بولے۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ جزیرہ چکر دے دے گا اور وہ بھی ایسا کہ ہم لوگ چکرا جائیں گے۔" سراج دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔
"میرا تو خیال ہے ہمیں ناریل سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانی چاہیئے۔" نعمان نے للچائی ہوئی نظروں سے ناریل کے درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اتنے اونچے درختوں پر کون چڑھے گا؟" شاہد نے گردن اوپر کرتے ہوئے کہا۔
"ہمیں درخت پر نہیں چڑھنا پڑے گا۔ ناریل دیکھو کتنے آرام سے ملیں گے" طلحہ نے مسکراتے ہوئے کہا پھر زمین پر پڑے دو تین پتھر اٹھا کر اس نے بڑے درخت کی طرف اچھالے جہاں بہت سارے بندر چڑھے ہوئے تھے۔
پتھروں کا اوپر جانا تھا کہ بندروں کو غصہ آگیا اور انہوں نے دھڑا دھڑ ناریل توڑ توڑ کر ان کی طرف پھینکنے شروع کر دیئے۔
"ارے... ارے ..... بچو.......... دیکھو کوئی ناریل سر پر نہ لگ جائے۔" طلحہ نے چیخ کر کہا۔ بندروں نے بڑی تیزی سے ناریل مارنے شروع کر دیئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے بمباری ہو رہی ہو۔ "بھاگو .... دیکھو کوئی ناریل نہ لگ جائے۔" چاروں دوست گھبرا کر بھاگے لیکن سراج کو تھوڑی سی دیر ہو گئی تھی۔ ایک بڑا سا ناریل اس کے سر پر پڑا اور ایک زوردار چیخ مار کر ..... زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جاری ہے

اس دلچسپ اور مزیدار کہانی کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

WORLD CUP '96

تحقیق و ترتیب : محمد عمر احمد خان

ورلڈ کپ ۱۹۹۶ء

خصوصی سپلیمنٹ

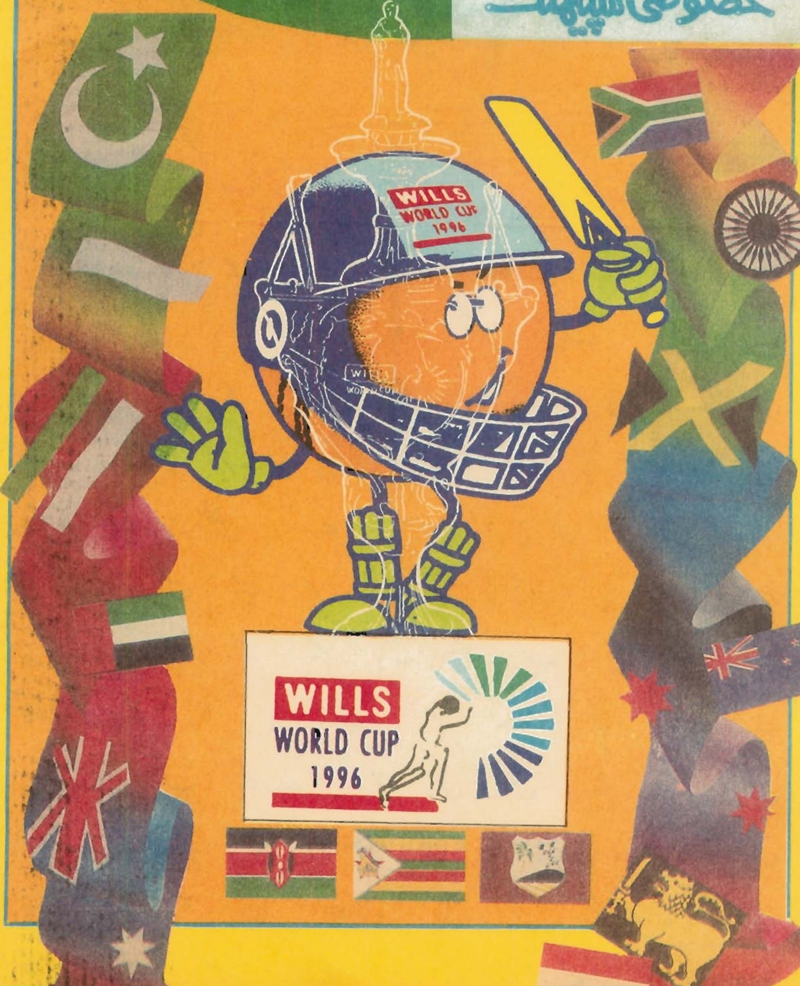

افشاں بشیر، کراچی

ورلڈ کپ میرے پاکستان کی تقدیر ہو جائے

گزشتہ رات میں نے اِک سہانا خواب دیکھا ہے
کتابِ فتح و نُصرت کا سُنہرا باب دیکھا ہے
یہ دیکھا ہے کہ کرکٹ ورلڈ کپ کے میچ ہوتے ہیں
غضب کے معرکے ہیں خُوب داوٗ پیچ ہوتے ہیں
خُدا کے فضل سے مضبوط پوزیشن ہماری ہے
کہ ٹیم پاک دُنیا بھر کی سب ٹیموں پہ بھاری ہے
یہ دیکھا ہے کہ ٹیمِ پاک کا جب میچ ہوتا ہے
مُخالف ٹیم کا ہر گیند ہم سے کیچ ہوتا ہے
یہ دیکھا ہے ہمارے کرکٹر تن تن کے آتے ہیں
تو پھر ایک ایک اوور (Over) میں وہ ڈھیروں رن بناتے ہیں
مخالف ٹیم کا رن (Run) کوئی ہم بننے نہیں دیتے
سکوں لینے نہیں دیتے ہیں دم لینے نہیں دیتے

جو ٹیمِ پاک بڑھ کے اِک ذرا للکار دیتی ہے
مُخالف ٹیم اپنی ساری ہمّت ہار دیتی ہے
کیا جانے لگا فتح و ظفر کا اہتمام آخر
لگانے کو بڑھے چھکے پہ چھکا انضام آخر
مِلی ہے سعیٔ پیہم سے بالآخر آبرو ہم کو
یہ دیکھا ہے خُدا نے کردیا ہے سُرخ رُو ہم کو
یہ دیکھا ہے کہ ٹیمیں گیارہ ہم سے ہار جاتی ہیں
بے چاری سب کی سب دوبارہ ہم سے ہار جاتی ہیں
ہمارے ہر کِھلاڑی نے ہُنر اپنے دِکھائے ہیں
سرے میدان جوہر اپنے آزمائے ہیں
یہ دیکھا ہر کِھلاڑی فخرِ پاکستان لگتا ہے
لیا ہے ورلڈ کپ جس نے مِرا کپتان لگتا ہے
خُدایا آج جو ہے خواب وہ تعبیر ہوجائے
کہ یہ کب میرے پاکستان کی تقدیر ہوجائے

ورلڈ کپ ۹۶ء کی پاکستانی ٹیم

شائستہ مومن

وسیم اکرم (کپتان)

تاریخ پیدائش : ۳رجون ۱۹۶۶ء (لاہور)
شمار: بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے مڈل آرڈر بیٹسمین
اور تیز رفتار بولر (آل راؤنڈر)
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۱۹۳ میچز، ۱۷۴۶ رنز،
سب سے زیادہ اسکور ۸۶، ۲ نصف سنچریاں ۔
وکٹوں کی تعداد: ۲۸۲، بہترین بولنگ ۱۵ رنز دے کر
۵ وکٹیں ۔
۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں ۔

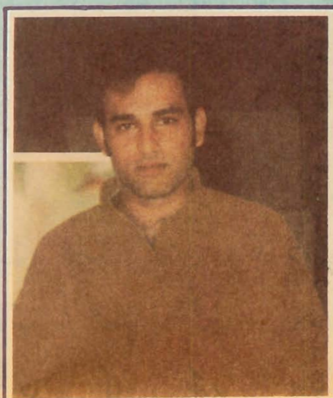

عامر سہیل (نائب کپتان)

تاریخ پیدائش : ۱۴ستمبر ۱۹۶۶ء (لاہور)
شمار: بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے ابتدائی کھلاڑی اور
اسپین لیفٹ آرم بولر (آل راؤنڈر)
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۸۵ میچز، ۲۶۸۴ رنز، سب
سے اسکور ۱۳۴، ۳ سنچریاں، ۱۷ نصف سنچریاں۔
وکٹوں کی تعداد: ۵۹، بہترین بولنگ: ۲۲ رنز دے
کر چار وکٹ ۔
۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں ۔

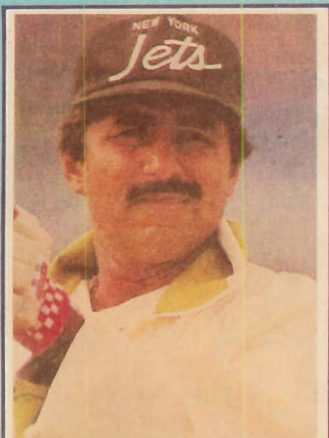

جاوید میانداد

تاریخ پیدائش: ۱۲جون ۱۹۵۷ء (کراچی)
شمار: دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے مڈل آرڈر بیٹسمین،
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۲۲۸ میچز، ۷۳۲۷ رنز،

سب سے زیادہ اسکور ۱۱۹ ناٹ آؤٹ، سنچریاں ۸، نصف سنچریاں ۵۰ ۔

اب تک ہونے والے پانچوں ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں۔

چھٹا ورلڈ کپ کھیل کر سب سے زیادہ ورلڈ کپ کھیلنے والے واحد کھلاڑی بن جائیں گے ۔

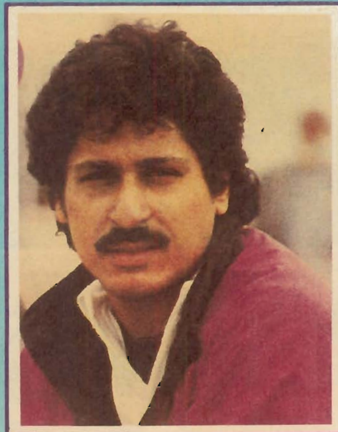

رمیز راجہ

تاریخ پیدائش: ۱۴ر اگست ۱۹۷۲ء (فیصل آباد)

شمار: دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے ابتدائی یا مڈل آرڈر بیٹسمین ۔

ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۱۷۰ میچز، ۵۲۵۷ رنز، سنچریاں ۹، نصف سنچریاں ۲۹ ۔

۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں۔

ثقلین مشتاق

تاریخ پیدائش: ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۶ء (لاہور)

شمار: دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے آخری نمبروں کے بیٹسمین

اور آف بریک بولر ۔

ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۵ میچز، ۳۰ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۳۰ رنز ۔

وکٹوں کی تعداد: ۸، بہترین بولنگ ۴۷ رنز دے کر چار وکٹیں ۔

موجودہ ٹورنامنٹ ان کا پہلا ورلڈ کپ ہے ۔

سعید انور

تاریخ پیدائش: ۶ر ستمبر ۱۹۶۸ء (کراچی)

شمار: بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے ابتدائی کھلاڑی

ون ڈے میچوں کا ریکارڈ: ۸۲ میچز، ۲۵۴۱ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۱۳۱، سنچریاں ۸، نصف سنچریاں ۷

اس ورلڈ کپ میں پہلی بار اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں گے ۔

اعجاز احمد

تاریخ پیدائش : ۲۰ ستمبر ۱۹۶۸ء (سیالکوٹ)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے مڈل آرڈر بیٹسمین اور بائیں ہاتھ سے بولنگ کرنے والے سلو میڈیم بولر
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۱۲۱ میچز، ۲۳۹۱ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۱۲۴ ناٹ آؤٹ، سنچریاں ۸، نصف سنچریاں ۱۰، بہترین بولنگ ۳۱ رنز دیکر ۲ وکٹیں۔
۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں۔

راشد لطیف

تاریخ پیدائش : ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء (کراچی)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے لوئر آرڈر بیٹسمین اور مستند وکٹ کیپر۔
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۷۰ میچز، ۵۱۷ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۳۹ رنز
موجودہ ٹورنامنٹ ان کا پہلا ورلڈ کپ ہے۔

مشتاق احمد

تاریخ پیدائش : ۲۸ جون ۱۹۷۰ء (ساہیوال)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے آخری نمبروں کے بیٹسمین اور لیگ بریک گگلی بولر۔
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۹۰ میچز، ۲۶۴ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۲۶ رنز۔
وکٹوں کی تعداد : ۹۹، بہترین بولنگ ۱۴ رنز دے کر ۳ وکٹیں۔
۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں

عطاء الرحمٰن

تاریخ پیدائش : ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء (لاہور)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے آخری نمبروں کے بیٹسمین اور فاسٹ میڈیم بولر۔
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۳۵ میچز، ۲۷ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۱۱ ناٹ آؤٹ۔
وکٹوں کی تعداد : ۲۱، بہترین بولنگ : ۳۲ رنز دے کر ۳ وکٹیں
موجودہ ٹورنامنٹ ان کا پہلا ورلڈ کپ ہے۔

عاقب جاوید

تاریخ پیدائش : ۵ اگست ۱۹۷۲ء (شیخوپورہ)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے آخری نمبروں کے بیٹسمین اور فاسٹ میڈیم بولر۔
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۱۲۱ میچز، ۱۴۴ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۲۱ رنز۔
وکٹوں کی تعداد : ۱۳۴، بہترین بولنگ : ۳۷ رنز دے کر ۷ وکٹیں۔
۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں

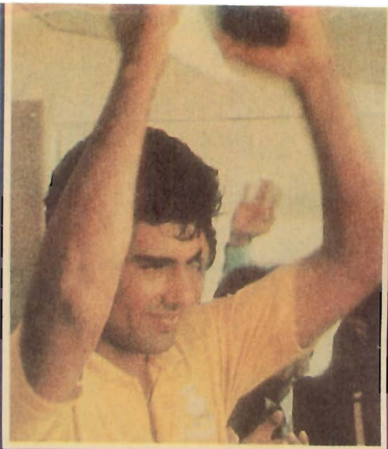

وقار یونس

تاریخ پیدائش : ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء (بورے والا)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے آخری نمبروں کے بیٹسمین اور تیز رفتار بولر ۔

ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۱۱۲ میچز ، ۲۳۶ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۳۷ رنز ۔
وکٹوں کی تعداد : ۱۸۷ ، بہترین بولنگ : ۲۶ رنز دے کر چھ وکٹیں ۔

۱۱۲ میچز میں پچھلا کوئی ورلڈ کپ شامل نہیں ہے ۔

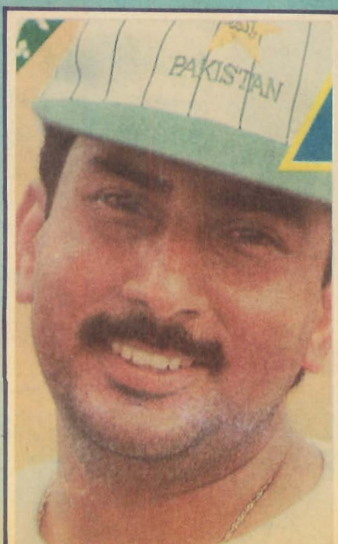

سلیم ملک

تاریخ پیدائش : ۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء (لاہور)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے مڈل آرڈر بیٹسمین اور سلو میڈیم بولر ۔

ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۲۱۴ میچز، ۵۳۴۲ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۱۰۲ سنچریاں ۵ ، نصف سنچریاں ۳۵ ، بہترین بولنگ ۳۵ رنز دے کر پانچ وکٹ ۔

۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے ورلڈ کپ میں شامل تھے ۔

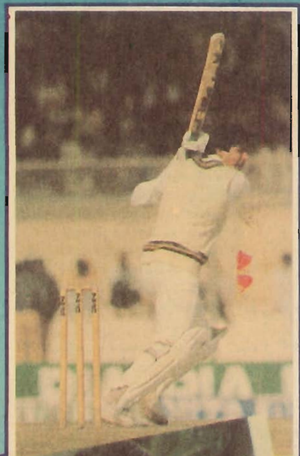

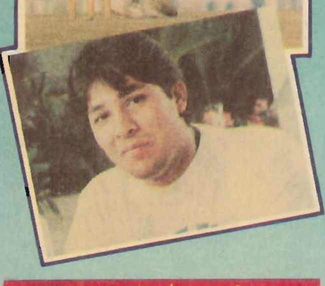

انضمام الحق

تاریخ پیدائش : ۳ر مارچ ۱۹۷۰ء (ملتان)
شمار : دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے مڈل آرڈر بیٹسمین ،
ون ڈے میچوں کا ریکارڈ : ۹۶ میچز، ۳۳۰۶ رنز، سب سے زیادہ اسکور ۱۳۷ رنز ناٹ آؤٹ ، سنچریاں ۴ ، نصف سنچریاں ۲۴ ۔

۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں ۔

خبریں و بریں

محمد اظہر خان

میانداد کی واپسی

کہتے ہیں کہ لیجنڈ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ جاوید میانداد ایسے ہی کھلاڑی ہیں۔ کرکٹ میں ان کی ڈرامائی واپسی نے شائقین کرکٹ میں جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔ میانداد اب تک پانچوں ورلڈ کپ کھیل چکے ہیں۔ موجودہ ورلڈ کپ کھیلنے کے بعد وہ دنیا کے واحد کھلاڑی بن جائیں گے جس نے چھ ورلڈ کپ مسلسل کھیلے ہوں گے۔

پاکستان کے لئے ان کا یہ ریکارڈ ایک اعزاز ہوگا۔

انجیکشن نے کام کر دکھایا

۱۹۹۲ء کا ورلڈ کپ جتوانے والے انضمام الحق کے گھٹنے میں چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے ورلڈ کپ کے ابتدائی میچوں میں ان کی شمولیت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن لندن میں صرف ایک انجیکشن نے کام کر دکھایا اور ان کے گھٹنے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ انضمام الحق صحت یاب ہونے کے بعد ورلڈ کپ اعزاز کا دفاع کرنے اور اپنی دھواں دھار بیٹنگ سے شائقینِ کرکٹ کو محظوظ کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔

کرکٹ کے تین ستارے

آسٹریلیا کے ایلن بورڈر، ڈیوڈ بون اور کیوی ٹیم کے شہرۂ آفاق کرکٹر مارٹن کرو کرکٹ کو الوداع کہہ چکے ہیں۔ تینوں کا شمار دنیا کے عظیم بلے بازوں میں ہوتا تھا۔ اپنے اعلیٰ کھیل سے ایک عرصے تک انہوں نے کرکٹ کے میدانوں کو رونق بخشی۔ اپنے ملک کیلئے سب سے زیادہ رنز بنائے اور اپنی ٹیموں کی جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ بورڈر، مارٹن کرو اور بون اگر چھٹے ورلڈ کپ کے بعد ریٹائر ہوتے تو شائقین انہیں ایکشن میں دیکھ سکتے۔

عزم و ارادے

ہم جیتیں گے...

نادیہ کوثر

ہماری ٹیم کے ہر کھلاڑی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر میچ جیتنے کے ارادے سے میدان میں اتریں گے.... ورلڈ کپ ہمارا ہے!!

وسیم اکرم (پاکستان)

شین وارن اور میک گرا ہمارے لئے کامیابیوں کے دروازے کھولیں گے۔ کوئی ٹیم ہمارے سامنے ٹھہر نہیں سکے گی۔

مارک ٹیلر (آسٹریلیا)

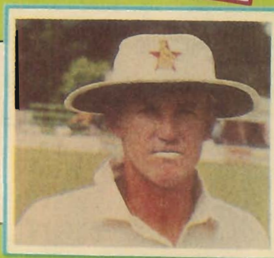

زمبابوے نے دو ورلڈ کپ میں دو میچ جیتے ہیں۔ ہمارا چانس ہے!!

اینڈی فلاور (زمبابوے)

گزشتہ پانچ سالوں میں ہم نے اپنے ہوم گراؤنڈ پر کوئی ون ڈے سیریز نہیں ہاری ہے۔ اس لئے ورلڈ کپ بھی جیتیں گے۔

محمد اظہر الدین (انڈیا)

مبصرین کو ہماری تیاریوں کا علم نہیں۔
اس مرتبہ ورلڈ کپ ہمارا
ہے !!
مائیک ایتھرٹن (انگلینڈ)

ہم ورلڈ کپ میں بہترین کارکردگی
کا مظاہرہ کریں گے۔
رچی رچرڈسن (ویسٹ انڈیز)

ہمیں میزبان ٹیموں سے زیادہ
خطرہ ہے لیکن فائنل ہمارا ہے!!
ہنسی کرونئے (جنوبی افریقہ)

ہمارے کھلاڑی اپنی اعلیٰ کارکردگی سے
بھارت اور پاکستان کی وکٹوں پر کامیابیوں
کا نیا باب لکھیں گے۔
لی جرمن (نیوزی لینڈ)

ہم جیت سکتے ہیں، بشرطیکہ قسمت
مہربان ہو جائے۔
سلطان زروانی (متحدہ عرب امارات)

ہماری بیٹنگ لائن بے حد
مضبوط ہے۔ ہم فائنل تک
جائیں گے۔
ارجنا راناٹنگا (سری لنکا)

ہم ابتدا کر رہے ہیں۔ اگلی
صدی ہماری ہوگی !!
اسٹیون لیوبرز (ہالینڈ)

ہم یہاں جیتنے کے ساتھ ساتھ کچھ
سیکھنے بھی آئے ہیں !!
موریس اوڈبے (کینیا)

صدف سراج

عمران

تو ہمیں یاد رہے گا...

عمران خان کرکٹ کے وہ ستارے ہیں جن کی یاد شائقینِ کرکٹ کے دلوں میں ہمیشہ جھلملاتی رہے گی۔ ۱۹۹۲ء میں وہ سخت دباؤ میں تھے ان کے کاندھوں پر پاکستانی ٹیم کی قیادت کا بوجھ تھا اور پہلے میچ سے دو دن

پہلے ان کا کاندھا زخمی ہوگیا تھا۔ وہ نہ تو بولنگ کر سکتے تھے اور نہ بیٹنگ۔ لیکن انہوں نے ٹیم کی مسلسل ہار کے باوجود ہمت نہ ہاری اور اپنی دلیرانہ قیادت میں پاکستان کو پانچواں ورلڈکپ جتوا کر دیا۔

عمران از دی گریٹ

انتخاب: محمد افسر قریشی

گزشتہ ورلڈکپ کے چند دلچسپ ریکارڈز

ایسا بھی ہوتا ہے

ورلڈکپ میں کسی کپتان کی جانب سے بہترین بولنگ کا مظاہرہ ۱۳ جون ۱۹۸۳ء کو ناٹنگھم میں دیکھنے میں آیا جب تیسرے ورلڈکپ میں آسٹریلیا کے خلاف بھارتی کپتان کپیل دیو نے ۴۳ رنز دے کر پانچ وکٹیں حاصل کی تھیں۔ اس شاندار کارکردگی کے باوجود بھارت ۱۶۴ رنز سے ہار گیا۔

کم زیادہ

وقار یونس چھٹے ورلڈکپ میں شرکت کر کے ایک حیرت انگیز ریکارڈ بنائیں گے۔ وہ اپنا پہلا ورلڈکپ کھیلنے سے قبل زیادہ سے زیادہ ون ڈے انٹرنیشنل کھیلنے والے کھلاڑی بن جائیں گے۔ اب تک وہ ایک سو بارہ میچز کھیل چکے ہیں لیکن ان کے پہلے ۱۰۰ ایک روزہ مقابلوں میں ایک بھی ورلڈکپ شامل نہیں۔

خوشیاں کہاں ملتی ہیں

ویسٹ انڈیز نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ کی ابتدا لارڈز کرکٹ گراؤنڈ پر ۲۳ جون ۱۹۲۸ء کو کی تھی۔ ۵۱ برس بعد اسی مقام پر اور اسی تاریخ کو انہیں ایک لازوال خوشی حاصل ہوئی جب انہوں نے ورلڈکپ دوسری بار جیتا۔ اسی طرح بھارت نے اپنے پہلے ٹیسٹ کا آغاز ۲۵ جون ۱۹۳۲ء کو لارڈز ہی پر کیا تھا۔ ٹھیک ۵۱ سال بعد اسی مقام پر اسی تاریخ کو انہیں بھی تیسرا ورلڈکپ جیتنے کا اعزاز ملا۔

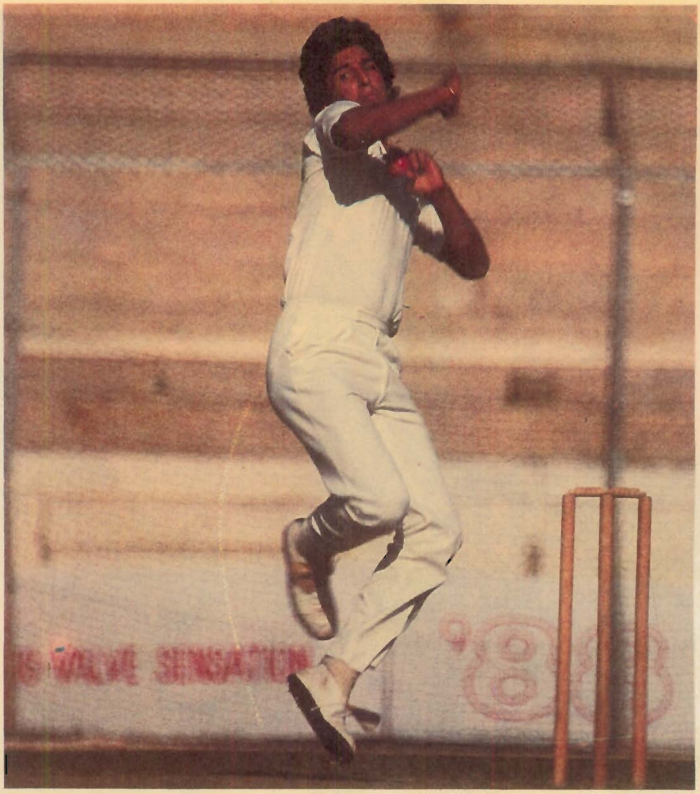

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔ ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں جہاں وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہورہے ہوں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل

باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

CYAN MAGENTA YELLOW BLACK

LASER DOT

THINNER

CYAN MAGENTA BLACK

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے
یہ خوبی سب نے پہچانی
محفوظ ڈھکن کی آسانی
صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھُلنے اور
بند ہونے والا ڈھکنا
اور اس کے نیچے نرم فوائل
کی سیل جس کی بدولت
حبیب بناسپتی کی
اعلیٰ کوالٹی اور تازگی
آخر تک برقرار۔
حبیب
بناسپتی
بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہترین
MASS

نورس
UQRA
شربت نورس
شربت نورس انتہائی کاوش، جدید ترین مشینری کی مدد اور ماہرین
کی انتھک کوششوں کو یکجا کر کے سائنٹیفک اصولوں کے تحت تکمیل
کو پہنچتا ہے۔ نورس کا ذائقہ ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا ایک
ایک گھونٹ مفرح اور صحت بخش ہے۔ اسے دودھ، آئس کریم، کسٹرڈ اور
قلفی میں استعمال کرنے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے اور موسم برسات
میں تازہ لیموں کے ساتھ نورس فریش لائم موسم کے مضر اثرات
سے محفوظ رکھتا ہے۔
نورس قومی مشروب
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی 112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی 75700
ٹیلکس:
فون نمبر:
(5 لائنیں)

Colorscan

REGD. No. SS-246 MARCH 1996

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

STICKS

PAPER,

CARDBOARD,

FABRIC,

PHOTOS,

POLYSTYRENE FOAM

SERIOUSLY

SAFE FOR CHILDREN

CONTAINS NO SOLVENT

NON TOXIC

CLEAN

CONVENIENT

Imported by

EUREKA TRADING COMPANY

11 & 12 Shaheen Towers, 23-A Block 6, P.E.C.H.S.,
Shahrah-e-Faisal, Karachi 75400 Pakistan
Tel: 4540791 4540792 Fax: (92-21) 4540793